سجن سدائیں سوجھرو

کنیز نبوی

www.paksociety.com

کنیز نبوی

سجن سائیں سوہنٹرو

(سجن ہمیشہ روشن)

محبت کے اظہار کے سو طریقے ہیں لیکن اس کیفیت کا مکمل احساس بیان کرنے کے لیے دنیا کی کسی بھی زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ اظہار کرنے بیٹھو تو الفاظ بے بس ہو کر ہار مان لیتے ہیں۔ وہ چاہنے کے باوجود ماروی تک سے اپنے احساسات کا اظہار نہ کر سکا تھا۔ اپنے ہجر کی داستان فراق کا سوز اور دوری کا پُردرد احساس اس تک نہ پہنچا سکا۔ اس کی سالوں پر محیط محبت کے اندر شام غریباں کا سا سوز تھا۔ اس کے قلب وجاں کا ہر احساس لُٹ چکا تھا۔ محبت کے ہاتھوں وہ کتنا بے اماں ہو گیا تھا۔ اس شام جب گل نے کہا تھا۔

"سائیں! ان تلوں میں تیل نہیں' اپنی ماں اور نانی کا انجام دیکھ کر اسے مرد اور محبت پر بھروسا نہیں۔ وہ مرد کی محبت کو پانی کا بلبلہ سمجھتی ہے۔ وہ تمہارا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی۔ بہتر ہے کہ اس کا خیال دل سے نکال دو۔"

شام کی ٹھنڈی ہواؤں میں بھی وہ سارا پسینے میں نہا گیا تھا۔ بے سکونی نے اس کے جسم وجاں میں پنجے گاڑے تھے۔ وہ بے تحاشا پریشانی کے عالم میں گل کے

مکمل ناول



گھر سے لوٹا تھا۔

بابا مکی شاہ کے مزار سے گزرا تو ایک خسرو خیرات کے لیے صدا لگا رہا تھا۔ دوسری طرف اسے دیکھ کر قوال پارٹی نے ہارمونیم چھیڑ دیا تھا۔ اس نے دونوں طرف نوٹ اچھالے اور آگے بڑھ گیا۔

دونوں طرف سے "تیری مراد بر آئے" کی صداؤں نے اس کے دل کو جکڑا۔ دل کے اندر اور درد بھر گیا۔

محبت بھی کسی آسیب سے کم نہیں ہوتی کہ اس میں بھی بندہ چیختا چلاتا' روتا گڑگڑاتا رہتا ہے۔

وہ ساری رات حیدر آباد کے مختلف علاقوں میں آٹو بھان روڈ' لطیف آباد' قاسم آباد' تلک چاڑی' صدر کنٹونمنٹ ایریا' پکا قلعہ سے جام شورو تک موٹر سائیکل پاگلوں کی طرح دوڑاتا رہا۔

فجر کے وقت تھک ہار کر ہاسٹل آیا تو اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ مختلف سڑکوں اور درگاہوں پر روتے روتے تھک گیا تھا' اب سونا چاہتا تھا۔

تیسری ٹرینکولائزر لینے کے بعد وہ بے سدھ ہو گیا تھا۔ وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔

محبوب کی اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوگی کہ وہ جسے چاہے وہ اسے نظر انداز کردے۔ جس کو وہ پوجے وہ اسے دھتکار دے مگر اس کی آہ و بے اثر نہیں تھی۔ ماروی کے دل کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ جب ماروی کی مشکل کلی کی زبانی اسے پتا چلی' اس نے پھر جیسے ہر جگہ ماروی کی نگرانی و حفاظت اپنا فرض اولین سمجھ لیا۔

اور پھر خود بخود اس کے لیے راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں۔ وہ اس کی تھی اب۔

وہ گاؤں میں نہر کنارے بیٹھا اس کی یادوں میں کھویا تھا' تب ہی میسج ٹون بجی۔ اس نے فوراً" موبائل جیب سے نکالا۔

"تم نے مجھے ایک نئے جذبے سے آشنائی دی ہے' راستے میں ساتھ نہ چھوڑ دینا۔" اس کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ مسکراہٹ آئی۔

اس نے جواب میں بھٹائی کا بیت لکھا تھا۔

وری ورندا واؤ وری وسندا مینہ
بجن ملندا سجنیں نواں لگندا مینہ
وچھوڑے جاؤنہہ رہی وھندا کیترا

(وصل کی ہوائیں بارشیں برسیں گی اور بجن سجنوں سے ملیں گے۔ عشق کے نئے باب کھلیں گے۔ جدائی کے دن آخر کتنے رہیں گے۔ جدائی کا عرصہ بالآخر ختم ہو گا۔)

اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا' ماروی اس کا میسج پڑھ کر مسکرائی تھی۔ وہ دیر تک سرشاری کے عالم میں ڈوبا رہا۔

☼ ☼ ☼

"آج دودھ دوہنے میں دیر کردی اماں؟" وہ پیڑا رکھ کر ماں کے پاس آبیٹھا۔

"ہاں' پخترا (پڑوس) میں دیر ہو گئی۔ قرآن خوانی میں گئی تھی۔" وہ دودھ چولہے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"ماں! ماروی مان گئی ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"شادی کے لیے؟"

"جی' جیجل اماں!" اس کا انگ انگ مسکا رہا تھا۔

ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔ نم آنکھوں سے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔ بیٹے کو راتوں کو بے خواب رت جگے کا عذاب جھیلتے دیکھ کر اس کے لبوں پر بے ساختہ دعا ٹھہر جاتی۔

وہ اپنے دونوں گالوں پر رکھے ماں کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر باری باری چومنے لگا۔

"اماں! یہ سب آپ کی دعاؤں کا ثمر ہے۔"

"ہاں بچہ! مالک مٹھے کی لاکھ مہربانیاں کہ مجھ نمانی عیبوں بھری کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دیا۔ ہر وقت دعا مانگتی ہوں۔ اے اللہ! کل جہاں کے بچوں کو آباد رکھ ان کے صدقے میرے بچوں کو آباد رکھ۔"

وہ آمین کہہ کر ان کے گھٹنے سے لگ گیا۔

وہ وفورِ محبت سے اس کے سر' منہ پر' شانوں پر ہاتھ پھیرتی دعائیں دیتی جارہی تھی۔

ماروی کی ماں اور نانی کی کہانی سرود کی زبانی سن کے اسے حقیقی معنوں میں ان سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی مگر بات وہ خود بگاڑ کے آئی تھی اور اب پریشانی سے دعا کرتی رہتی تھی کہ ماروی راضی ہو جائے۔

☼ ☼ ☼

یہ ان دنوں کی بات تھی' جب پاکستان کے فوجی صدر نے ناعاقبت اندیشی سے پانچ دریاؤں کی سرزمین پنج آب کے تین دریا' ستلج' بیاس' راوی کوڑیوں کے مول بھارت کو بیچ دیے تھے جس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا تھا' ان ہی دنوں میں فائنل کا امتحان دے کر اس نے پرائمری ٹیچر کے لیے اپلائی کر دیا۔

ٹھیک تین ماہ بعد اس کو ملازمت کے آرڈر مل گئے۔ وہ خوشی خوشی مٹھائی لے کر سیدھا باپ کے پاس آیا تھا مگر باپ نے سن کر خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"احمد علی! کیوں چند ٹکوں کی نوکری کرتا ہے۔ اپنی زمین ہے' وہ سنبھال۔ سردار صاحب کی جاگیر کی دیکھ بھال کر۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ تو پڑھ لکھ جائے گا تو آرام سے سردار صاحب کی پوری جاگیر سنبھال لے گا مگر تو اس ڈیڑھ دو سو کی نوکری پر خوش ہو رہا ہے۔"

"بابا! میں سردار کا غلام نہیں بن سکتا۔" احمد علی سائگی نے قطعی لہجے میں کہا۔

"یہ بھی تو تو نوکر بنا ہے۔ کون سا صدر بن گیا ہے۔" اسے بیٹے کی بات پر طیش آگیا۔

"بابا! استاد نوکر نہیں' قوم کا محسن ہوتا ہے اور سرکار کی نوکری کون نہیں کرتا' سب کرتے ہیں یہ وڈیرے اور سردار بھی۔"

اس کا باپ لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ عالم اور دلیل کو بندہ مان لے' اسے ہار ماننے میں تامل نہیں ہوتا۔

اس نے دونوں ہاتھ باپ کے پیروں پر رکھ دیے۔

"مجھے افسوس ہے بابا! کہ میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اترا مگر میں نے علم کا راستہ وڈیروں کی غلامی سے نجات ہی کے لیے اپنایا ہے۔"

اس کے باپ نے خاموشی سے اس کی پشت سہلائی تھی۔ اس کا شمار سرداروں' وڈیروں اور جاگیرداروں کے ان کمداروں میں ہوتا تھا جو ان کے ہر کہے پر عمل کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے مگر اس بار بغاوت کسی مزارعے کی طرف سے نہیں' ان کے اپنے گھر سے اٹھی تھی۔ یہ گھر کا چراغ تھا جسے گل کر کے وہ اپنے آنگن میں اندھیرا نہیں پھیلا سکتا تھا' سو خاموش ہو گیا۔

اس نے افسوس سے باپ کو دیکھا جو سینکڑوں غلاموں میں سے ایک غلام تھا۔ ان سرداروں کا' جاگیرداروں کا جن کو انگریز سرکار نے وفاداری کے عوض سارے علاقے کی جاگیریں تفویض کی ہوئی تھیں۔ جو جاگیریں انگریز کے جانے کے بعد بھی قائم و دائم تھیں۔

کمدار دھنی بخش کا بیٹا احمد علی سائگی پتہ نہیں اس کے اندر ایسی انقلابی روح کہاں سے آگئی کہ اس نے سردار کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بجائے قلم اور کتاب سے ناتا جوڑ لیا۔ اس کے گاؤں میں اسکول نہیں تھا' اس لیے اس کا باپ اس کو داخل نہیں کروا

سکتا تھا مگر اس کے شوق نے جنون کی شکل اختیار کرلی تھی۔ گیارہ سال کی عمر میں اس نے باپ سے بغاوت کی اور پانچ میل دور پیدل جاکر اسکول میں داخلہ لے لیا۔

ماسٹر نیاز حسین اس کے باپ کا پک مٹ (پگڑی بدل) دوست تھا۔ اس کا شوق دیکھ کر اس نے اسے اپنے اسکول میں داخل کرلیا تھا۔

اس کی ضد اور ماسٹر نیاز حسین کی پُرزور سفارش پر اس کا باپ خاموش ہوگیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کہاں یہ گیارہ سال کا بچہ اور کہاں روزانہ پانچ میل پیدل کا سفر' دو دن میں شوق پورا ہوجائے گا۔

مگر اس کو صرف شوق نہیں' اسے تو جنون تھا۔ وہ پڑھتا رہا' کمدار نے سردار کو پتا نہیں کیا کہہ کر مطمئن کیا تھا۔

پرائمری کے بعد اس کے باپ نے پھر اس کے آگے پڑھنے کی مخالفت کی مگر اس بار بھی اس نے اپنی بات منوا کر دم لیا۔ ماسٹر نیاز حسین کی مدد اسے ابھی تک حاصل تھی۔ وہ قریبی تعلقے کے ہائی اسکول میں داخل ہوگیا۔

ماسٹر نیاز حسین کے گاؤں وہ روزانہ آسانی سے آجا نہ سکتا تھا' سو اس نے وہیں رہائش اختیار کرلی۔

ماسٹر نیاز حسین کی محبت نے اسے پیتل سے سونا بنا دیا۔ اس کے علم کی جوت کو جلا بخش دی۔ وہ شام کو اسکول سے آتا تو ماسٹر نیاز حسین اسے شاعری پڑھاتے' سمجھاتے۔ سندھی میں شاہ و سچل اور حمل فقیر کے اشعار کے معنی بتاتے۔ مصری شاہ کی کافیاں گاکر سناتے اور اردو میں غالب اور اقبال کے شعروں کی تشریح کرواتے پھر خود کرتے۔ اسے تاریخ پڑھاتے اور ہر چھٹی والے دن وہ اسے لے کر کچے میں جاتے۔ وہ سندھو دریا کو دیکھ کر خوش ہوتا رہتا اور ماسٹر نیاز حسین اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرکے ہاری (مزارعے) کو مختلف ہدایات دے کر اس کے پاس آجاتے۔

وہ دونوں برگد کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے اور حسب معمول شینہہ دریا (شیر دریا) کے قصے شروع ہوجاتے۔

"جب یہ دریا شیر کی طرح گجگوڑ (شور کرتے) کرتا آتا تو ساری فصلوں اور بستیوں کو چیر پھاڑ کے رکھ دیتا۔ اس کے ایک کنارے پر کھڑے ہوکر دیکھتے تو دوسرا کنارہ نظر نہ آتا' تاحد نگاہ پانی ہی پانی۔ ایسا لگتا جیسے یہ دریا نہیں' یہ کوئی بحر ہے۔"

ماسٹر نیاز حسین اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی کو سنوارتے ماضی میں کھو جاتے۔

"وید دنیا کی قدیم مذہبی کتاب جسے رشیوں نے اور مہاپرشوں نے سندھو کنارے بیٹھ کر لکھا۔ رگ وید میں سندھ کے لیے اشلوک اس طرح ہے۔

"بے خوف' نہ رکنے والی' طاقت ور سندھو' پہاڑوں اور میدانوں سے پانی کی لہریں چمکتی' شور کرتی' بہتی رہتی ہے۔

حسن والی تہذیب یافتہ سندھو' اچھے گھوڑوں والی شاہوکار سندھو۔

سوہنی گھڑے ہوئے سونے (زیوروں) میں ساہوکار۔

ان گنت وسائل کی مالک' یہاں کی گھاس آنکھوں کی ٹھنڈک۔

لذیذ' دمکتے سونے جیسا اناج

اور مٹھاس والا شربت۔"

ماسٹر نیاز حسین خواب ناک لہجے میں اشلوک کا ترجمہ اسے سناتے' سندھو کنارے چلتے رہتے۔

"پتہ ہے احمد علی! رگ وید میں سندھو کو اتم دیس" کہا گیا ہے' ست سندھو کے حوالے سے۔"

"ست سندھو' یہ کیا ہے ماسٹر جی؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ست سندھو یعنی سات دریاؤں والا ملک۔"

"اور وہ سات دریا کون سے ہیں؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

ماسٹر نیاز حسین بے ساختہ ہنس دیے۔

"وہ دریا کابل' بیاس' ستلج' راوی' چناب اور جہلم ہیں' جو سب ایک سندھو میں گرتے ہیں۔ مہابھارت

میں گنگا اور سرسوتی کے ذکر کے وقت سندھو کو ندیوں کی ماں کہا گیا ہے اور ویدوں میں گنگا کا ذکر دو بار جبکہ سندھو کا ذکر تیس بار آیا ہے۔ تاریخ میں سندھو کی عظمت اور شان ہی نرالی ہے۔"

ماسٹر نیاز حسین نے جوش سے کہتے آنکھوں کے اوپر ہاتھ کا چھجا بنا کر سندھو کے دوسرے کنارے کو

"مگر مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے کہ یہ دریا سکڑ نہ جائے۔" انہوں نے خود کلامی کی۔

اس بار سندھو کنارے سے واپسی کے بعد تاریخ سے گہرا شغف ہوگیا۔ اس نے ماسٹر نیاز حسین کی ذاتی لائبریری سے کتابیں نکال کر پڑھنا شروع کردیں۔ چچ نامہ' عربوں کی سندھ آمد کے بعد کی تاریخ سومرا' سمہ' کلہوڑا' تالپور' ادوار کی تاریخیں قدیم سندھو اور انگریزوں کی سندھ آمد کے بعد کی تاریخیں۔ اسے کچھ کتابیں ماسٹر نیاز حسین کی لکڑی کے بڑے صندوق سے ملیں اور کچھ پیر سائیں کرا محی الدین جیلانی کی ذاتی لائبریری سے' جہاں ہر قسم کی کتاب موجود تھی۔ پیر سائیں محی الدین' ماسٹر نیاز حسین کے مرشد تھے۔ وہ ہمیشہ کہتے۔ یہ نیاز حسین پیر سائیں کا نیاز مند ہے۔ پیر سائیں کی وجہ سے سردار اور رئیس کے علاقے کے بیچ اس گاؤں میں اسکول ہے' ورنہ وہ دونوں کبھی نہیں چاہتے کہ یہاں کے لوگ پڑھ لکھ کر ان کی غلامی سے آزاد ہوں۔

"پوری پاکستانی قوم ان سرداروں' وڈیروں کے پاس یرغمال بنی ہوئی ہے۔"

اس دن کے بعد اس کے دل میں پیر سائیں کرا محی الدین کی عزت گھر کر گئی۔

جب وہ خود ماسٹر بن گیا تو اس نے اپنے گاؤں میں اپنی اوطاق کے اک کمرے میں اسکول کھول لیا اور گاؤں کے بچوں کو گھروں سے پکڑ کر اسکول میں لا بٹھایا مگر یہ بات سردار کو پسند نہیں آئی۔ "فوراً" دھنی بخش کی طلبی ہوئی۔

"اگر سارے لوگ پڑھ لکھ جائیں گے تو ہمارے کام کون کرے گا؟"

"سردار سائیں! وہ بچہ ہے' جوانی کا جوش ہے' ابھی کچھ عرصے میں خود ہی چپ کرکے بیٹھ جائے گا۔" دھنی بخش نے خوشامدانہ انداز میں لجاجت سے کہا۔

"تم نے کہا تھا بیٹا اس لیے پڑھا رہا ہوں کہ سردار صاحب وہ میرے بعد آپ کی کمداری کرے گا۔ چار لفظ پڑھ لکھ لے گا تو جاگیر اچھی طرح سنبھال لے گا مگر یہ کیا ہو رہا ہے کہ وہ اپنی اوطاق میں اسکول کھول کر بیٹھ گیا ہے۔ میرے مقابلے پر آرہا ہے وہ۔"

سردار کی مونچھیں غصے سے پھڑکنے لگیں۔

"سائیں! آپ فکر نہ کریں' وہ کل کا بچہ بھلا کیا کرے گا۔ میں کل ہی وہ اسکول بند کروادوں گا۔"

"کمدار! تم اس کا نتیجہ جانتے ہو نا؟"

"ہاں سائیں! ہاں۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر یقین دلایا۔

وہ تھک ہار کر بیٹے کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"تو اگر چاہتا ہے کہ تیرے باپ کی پگڑی بھرے بازار میں اچھالی جائے' سردار اسے پورے راج میں ذلیل کرے تو اس سے پہلے یہ پگڑی میں تیرے پاؤں میں ڈالنا چاہتا ہوں کہ میری بے عزتی کرنے والوں میں تو اول رہے۔"

اس نے پگڑی اتار کر اس کے پاؤں میں ڈالی۔

پگڑی عزت کا نشان' اگر کوئی کسی کے پاؤں میں ڈال دے تو وہ اپنی ساری حق تلفیاں اور ناراضیاں بھول کر معافی دے دیتا ہے۔ پگڑی ڈالنا یعنی اپنی عزت دوسرے کے سامنے ڈال دینا ہے۔ پگڑی بہت سارے فیصلے اور تصفیے کروتی ہے اور اگر یہی پگڑی باپ بیٹے کے پیروں میں ڈال دے؟

اک قیامت تھی' وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔ فوراً آگے بڑھ کر پگڑی کو زمین سے اٹھایا۔

"بابا۔!" وہ صدمے اور حیرت سے بول نہ سکا۔ بے اختیار ہوکے بوسکی کی پگڑی کو چومنے لگا' آنکھوں سے لگانے لگا۔ اس کے بے ساختہ بہنے والے آنسو بوسکی میں جذب ہو رہے تھے۔

اس کے بڑے بھائی احسان نے اپنے باپ کو شانوں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا۔

اس نے پگڑی کا کپڑا لپیٹ کر باپ کی گود میں رکھا' خود زمین پر نیچے بیٹھ گیا اور باپ کی دونوں ٹانگوں سے لپٹ کر زاروزار رونے لگا۔

"بابا! کیوں ایسا قہر کر دیا۔ میرے تو دونوں جہاں گئے۔"

وہ وڈیرے کی غلامی بھرنے والے گرد آلود پاؤں کو چومنے لگا۔

"آپ کی رضا تو میرے رب کی رضا ہے۔ کیوں مجھے گناہ گار کر دیا۔ ایسی کیا غلطی ہو گئی مجھ سے کہ آپ نے مجھے ایسا بدبخت بنا دیا۔"

اس نے روتے بلکتے شکوہ کرتے بے گناہ باشعور بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔

"تمہیں نہیں پتہ احمد علی! تمہیں نہیں پتہ۔ یہاں جاگیردار' جنرل اور اعلا افسر یہ نہیں چاہتے کہ پاکستانی قوم باشعور اور خوش حال ہو۔ اگر یہ قوم خواندہ ہو گئی تو مطالبہ کرے گی کہ انگریزوں کے پٹھوؤں سے جاگیریں چھینو۔ اگر یہ قوم باشعور ہو گئی تو وہ جنرلوں کو بیرکوں میں بٹھا کر کہے گی' اقتدار کسی کو بھی سونپنا ہمارا حق ہے۔ یہ بدقسمت پاکستانی قوم خوش حال ہو گئی تو افسران کا احتساب شروع کر دے گی۔ میرے تبدیلی کے خواہاں سپوت! ان تینوں کا گٹھ جوڑ جب تک ختم نہیں ہو گا' یہ قوم اور ان کے مسائل ویسے ہی رہیں گے۔ یہ پاکستان پر قابض لوگ اور قوتیں عوام کو بنیادی مسائل' روزی روٹی کے جھگڑوں میں ہی الجھائے رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ جاگیردار' سرمایہ دار' جنرل اور افسران اس قوم کا یونہی استحصال جاری رکھیں گے۔"

وہ مایوسی سے کہتا اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔

"میرے انقلابی بیٹے! تم ایسے ملک میں تبدیلی لانا چاہتے ہو جہاں سردار' نواب و جاگیردار اپنے مخالفوں سے نفرت اور انتقام کی خاطر ان کے علاقوں میں اسکول کھلوا دیتے ہیں اور یہ وڈیرے "انتقاماً" ان سرکاری اسکولوں کو اپنے بھانڈے (اسٹور) بنا لیتے ہیں۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے احمد علی! ان سب نے مل کر ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ اگر ہم ان کی غلامی سے نکل گئے تو ان کے اقتدار تک پہنچنے والے دروازے بند ہو جائیں گے۔"

کمہار روشنی بخش کے لہجے میں صدیوں کا دکھ تھا۔

"میں نے پچیس سال سردار کی غلامی بھری ہے۔ میں نے ہمیشہ جنرل' جاگیردار اور افسر کو ایک ساتھ پایا ہے۔ ان تینوں کے مفادات ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ہم ان سے نہیں لڑ سکتے میرے بیٹے!"

اس نے بازو سے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا' اپنے گلے لگایا' پیشانی چومی۔

"چل میرے کھبو! کل میں تمہیں بھی ان کی غلامی میں دے دیتا ہوں۔ احسان کو تو پہلے ہی میں نے ان کے حوالے کر دیا ہے۔"

احمد علی تڑپ اٹھا۔ "نہیں بابا! نہیں' آپ میرے گلے میں یہ غلامی کا طوق نہ ڈالیں۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیں مگر سردار کے حوالے نہ کریں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر باپ کے آگے گڑگڑانے لگا۔

کمہار روشنی بخش کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔

"تو کل صبح سویرے نیاز حسین کے پاس چلا جا' میں سردار کو کہوں گا کہ میں نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اسکول بند ہو جائے گا۔"

اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور پاؤں چارپائی پر سیدھے کر کے لیٹ گیا۔

احمد علی اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔

آج اسے پتا چل گیا کہ اس کا باپ یہ طوق غلامی بخوشی نہیں "جبراً" گلے میں ڈالے بیٹھا ہے کیونکہ آج اس نے اپنے باپ کے پورے وجود میں تھکن' صدمے اور دکھ کی پرچھائیں دیکھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

گل کی زبانی ماروی مرتضٰی کا ذکر سن سن کر پتہ نہیں کیسے اسے بن دیکھے انسیت ہو گئی تھی۔

جب انٹر کا امتحان دے کر حیدر آباد کے ایک روزنامے میں اس کی اپرنٹس کی جاب لگی تھی تو وہ گل کے والد کے کہنے پر ان کے ہاں ہی رہنے لگا تھا۔

تب گل کی زبانی ماروی کا ذکر سن کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

"کیا تم کسی لڑکی سے دوستی کر سکتی ہو؟"

"کیوں' میں لڑکی نہیں ہوں کیا؟" اس نے سنجیدگی سے برا مانا۔

"نہیں' یہ بات نہیں۔ اصل میں آج تک کوئی لڑکی تمہاری گہری سہیلی نہیں بن سکی۔ ہمیشہ لڑکوں جیسا لباس' لڑکوں جیسے شوق اور لڑکوں جیسی ہی بے باک رہی ہو۔"

سرد سائیں ڈرتے ڈرتے بولا۔

"مجھے بابا سے بہت محبت تھی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "بچپن سے میں ان کو کاپی کرتی رہی۔ میری ضد یہی ہوتی کہ بابا جیسے کپڑے پہنوں' بابا جیسی دوستیاں رکھوں۔ تم بھی اسی لیے میرے گہرے دوست بنے کہ انکل احمد علی' بابا کے بہت گہرے دوست تھے اور پھر بابا کو بیٹے کا شوق تھا۔ سو انہوں نے مجھے بیٹوں کی طرح پال کر یہ شوق پورا کیا۔" اس نے وضاحت کی۔

جب اس کے منہ سے بار بار ماروی کا ذکر سنا تو اس سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔

"مجھے بھی اس سے ملواؤ۔"

"ہرگز نہیں۔ تمہیں پتا ہے وہ کسی کے گھر نہیں جاتی اور اس کے گھر میں تمہیں اس لیے نہیں لے جا سکتی کہ اس کی ماں بہت سخت ہے۔ اسے تو اس سے میری دوستی بھی پسند نہیں۔" اس نے انکار کیا۔

اس دن کے بعد سے اس نے پھر نہ کہا۔ اس نے بہت جلد ان کا گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لی۔ گو کہ گل اور انکل کو اس کی حرکت سے دکھ ہوا تھا مگر اس کو یہ مناسب نہیں لگا تھا کہ وہ ان کا مزید احسان لے۔ ویسے انکل تو سال میں آٹھ ماہ بیرون ملک دوروں پر رہا کرتے تھے۔ گھر میں صرف گل' نانی کے ساتھ ہوتی تھی۔

اسے یہ بات پسند نہیں تھی' وہ گھر میں اکیلی لڑکی کے ساتھ رہے۔ اب وہ ہر ویک اینڈ پر گل کے گھر جاتا' اب وہ اسی اخبار میں کرائم رپورٹر ہو گیا تھا۔

گریجویشن کے بعد اس نے سندھ یونیورسٹی میں ایم اے صحافت میں داخلہ لے لیا تھا۔ اتنے سالوں کے دوران کبھی ماروی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ اس کا ذکر وہ اب بھی گل کی زبانی سنتا رہتا۔ جب گل نے سوشل آرگنائزر کی جاب چھوڑی تو اپنی جگہ ماروی کو وہ جاب دلوا دی۔ اب تو ماروی پر پہلے جیسی روک ٹوک بھی نہیں تھی مگر پھر بھی اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

پہلی بار اس نے ماروی کو اس وقت دیکھا' جب بابا اللہ بچایو کا مسئلہ ہوا۔

گل نے اسے فون کیا تو وہ "فوراً" پہنچا۔

وہ پُرخلوص' ہمدردانہ طبیعت رکھنے والی لڑکی اسے بے حد اچھی لگی۔

ناجانے کب کی من میں چھپی گھونگھٹ نکالے بیٹھی محبت نے گھونگھٹ الٹا تھا۔ اس نے دبے لفظوں میں گل کو بتایا تو اس نے سر پکڑ لیا۔

"سائیں! تم نے بھی کہاں دل لگا لیا' وہ تمہیں گھاس بھی نہیں ڈالے گی۔" وہ جھنجلائی۔

"میں بکرا نہیں ہوں۔" وہ بڑے سکون سے مسکرایا۔ "میری محبت سچی اور پرخلوص ہو گی تو اپنا آپ خود منوائے گی۔"

"یعنی تمہیں پکا یقین ہے کہ تم اسے جیت لو گے؟"

"نہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔

"میں آہستہ آہستہ مکمل طور پر اپنا آپ اس کے سامنے ہار جاؤں گا۔"

"جب تک تم اسے جیت نہ لو؟" وہ دلچسپی سے مسکرائی۔

"جب تک وہ میری ہار قبول نہ کر لے' مجھے اپنا نہ مان لے۔"

"تم جیت کے لفظ سے کیوں بدک رہے ہو؟" گل کو اس بحث میں مزا آنے لگا۔

"اس لیے کہ جیتنے کی کوشش انسان کے اندر ضد پیدا کرتی ہے اور ضد انا کو توانا رکھتی ہے اور محبت میں انا نہیں ہوتی۔"

پھر کتنے سالوں تک وہ صبر کی فصل کاشت کرتا رہا۔ آخر اسے صبر کا پھل ملنا تھا۔

گل کے گھر میں کبھی اچانک ملاقات ہو جاتی تو وہ اس کے سلام کا بھی ٹھیک طرح سے جواب نہیں دیتی تھی۔ وہ اکثر گل پر بگڑ جاتا۔

"تم نے میری محبت کے بارے میں اس کو بتا کر مجھ سے متنفر کر دیا ہے۔"

اور وہ چڑ جاتی۔ "نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں، میں تو تمہارے لیے راہ ہموار کر رہی تھی۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ وہ بدک جائے گی۔ اسے تو جیسے مرد کی ذات سے ہی نفرت ہے۔"

"تم فکر نہ کرو، میں دوں گا اسے مرد کی ذات پر اعتماد۔" وہ پورے یقین سے کہتا تو گل کو بھی جیسے یقین آ جاتا۔ وہ بھی تو اپنی اس پیاری دوست کی زندگی میں خوشی چاہتی تھی۔



وہ ایک بار پھر ماسٹر نیاز حسین کے پاس آ گیا۔ پیر سائیں گردا محی الدین شاہ جیلانی نے اسے اپنے گاؤں کے اسکول میں ماسٹر نیاز حسین کے ساتھ رکھوا دیا۔

اس کے آگے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا تو اس کی مصروفیت، اسکول کی ناکامی کا غم، کسی قدر اس کے دل سے محو ہو گیا۔ پورے ایک سال تک وہ گاؤں نہیں گیا تھا۔ اس کے ماں اور باپ کبھی کبھار آ کے اس سے مل جاتے تھے۔ جب اس نے انٹر کا امتحان دے دیا تو اس کا باپ اس کو واپس لینے آیا۔ پتہ نہیں سردار کو اس نے کیسے راضی کر لیا تھا۔ وہ جب گاؤں پہنچا تو اس وقت اسے علم ہوا کہ اس کی شادی کی جا رہی ہے۔ وہ پریشان تو ہوا مگر اس میں باپ کے سامنے انکار کی ہمت نہیں تھی۔ یوں زیب النساء اس کی زندگی میں آ گئی، وہ اس کی چچا زاد تھی۔ سگھڑ، سلیقہ شعار، ہنرمند مگر اس کی ناخواندگی اس کو کھٹکتی تھی۔

وہ اس سے کہتا۔ "تم پڑھو، میں تمہیں پڑھاتا ہوں۔"

"میں۔۔۔ اس عمر میں۔۔۔؟" وہ حیرت سے اسے دیکھتی۔

"ہاں، کیوں۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟"

"نہیں، گاؤں کی عورتیں میرا مذاق اڑائیں گی کہ شوہر سے پڑھ رہی ہے۔"

اس نے بہت کوشش کی مگر وہ مان کے نہیں دی، وہ بددل تو ہوا مگر ابھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ آہستہ آہستہ وہ پڑھ لے گی۔

کچھ عرصے بعد ماسٹر نیاز حسین کا چھوٹا بیٹا مختیار کار منظور حسین اپنی دوسری شادی کا کارڈ لے کر آیا، سب کو حیرت ہوئی۔

"اتنی اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے شہر میں شادی رچانا کہاں کا انصاف ہے منظور حسین؟" کمدار دھنی بخش نے استفسار کیا۔

"چاچا! میری بیوی اچھی تو ہے پر پڑھی لکھی نہیں۔ وہ شہر میں میرے ساتھ نہیں رہ سکتی، اسی لیے میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔"

احمد علی نے دیکھا۔ زیب النساء کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک دم سے ایک ترکیب آئی۔

"ہاں ہاں ادا! اچھا کر رہے ہو، اب شہر میں رہنے کے لیے شہری بیوی چاہیے۔ پڑھی لکھی۔" اس نے کن انکھیوں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے بمشکل مسکراہٹ دبائی تھی۔

کچھ دنوں بعد وہ خود کتاب لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "میں پڑھوں گی۔"

"اچھا پڑھو گی تم؟" لیٹے ہوئے احمد علی نے تکیے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "نہیں، تم نہیں پڑھ سکتیں۔ مجھے کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔" آخری جملہ زیر لب اسے سنانے کو کہا اور کروٹ بدل لی۔

"کیوں؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"اس لیے کہ تمہیں شوق تو ہے نہیں پڑھنے کا۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"نہیں، آپ جو چاہیں، مجھ سے قسم لے لیں۔ میرا پکا وعدہ پڑھنے کا۔"

"اچھا!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "چلو دیکھتے ہیں، پڑھ سکتی ہو کہ نہیں۔" اس کے لہجے سے مایوسی ظاہر ہو رہی تھی۔

زیب النساء کو لگا کہ وہ دوسری شادی کا بہانا ختم ہونے پر مایوس ہوا ہے۔

وہ بڑی دل جمعی سے پڑھنے لگی۔ ایک سال میں دو کلاسیں پڑھتی رہی۔ احمد علی اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے بھی پڑھاتا رہا۔ اس کے گریجویشن تک زیب النساء نے بھی آٹھ جماعتیں پاس کر لی تھیں۔

ان ہی دنوں اس کی مختلف محکموں میں بھیجی ہوئی ملازمتوں کی درخواستوں کے جواب آ گئے۔ اے ایس آئی، کے ای ایس سی میں اچھی پوسٹ اور ٹیچنگ۔ دوست یاروں نے مشورہ دیا کے ای ایس سی کی ملازمت اختیار کر لو، بڑے فائدے ہیں۔ کار، پیٹرول، ٹیلی فون، بجلی، گیس، سب مفت، گھر کا فرنیچر بھی کارپوریشن دیتی ہے۔ اگر گھر بنواؤ گے تو ریتی، بجری اور ڈیڑھ سو فٹ لکڑی بھی مفت ملے گی۔

اگر پولیس میں جاؤ گے تو بھی ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ ہیں۔ روز کی کمائی اور طاقت کا نشہ الگ ہی چیز ہے۔ لیکچرر شپ میں کیا رکھا ہے مگر بنیادی طور پر جس علاقے سے اس کا تعلق تھا، وہ روحانیت کی سرزمین تھی۔ مادہ پرستی سے کوسوں دور۔ اس میں اپنی مٹی کے اثرات تھے سو اسی کو چنا۔ جس میں کچھ نہیں رکھا تھا، اس کا فطری رجحان اور میلان علم کی طرف تھا۔ وہ علم کو چھوڑ کر مادہ پرستی نہیں اختیار کر سکتا تھا۔ سو اس نے سندھ مسلم کالج کو ترجیح دی۔ یہ تب کی بات تھی جب پھلتا پھولتا کراچی امن کا گہوارہ تھا جسے سندھ کو واپس کیے ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا۔ دیہاتوں سے لوگ آ کر یہاں ملازمتوں کے حصول کی کوششوں میں مصروف تھے۔

وہ اپنی فیملی کو لے کر کراچی منتقل ہو گیا۔ پاس پڑوس میں نا کوئی جان نا پہچان۔ دیہاتی ماحول سے اٹھ کر شہر آنا زیب النساء بخت افسردہ ہوئی۔ کچھ ہی عرصے میں اس زندگی سے اکتا گئی، اپنی مشکل احمد علی کے سامنے رکھی۔

"میں واپس گاؤں جانا چاہتی ہوں، مجھ سے نہیں رہا جاتا اجنبی اور بیگانہ ماحول میں۔"

احمد علی مسکرا دیا۔ یہ اس کے لوگوں کی ازلی کمزوری تھی۔ وہ سندھ کے ایک شہر سے دوسرے شہر تک بھی ہجرت نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کی اس فطرت سے لاعلم نہیں تھا۔

"زیب النساء! کراچی کوئی علاقہ غیر نہیں، پاکستان کا، ہمارے صوبہ کا حصہ ہے۔ دیہات بھی ہمارے ہیں اور شہر بھی ہمارے۔ گاؤں اس لیے چھوڑ کر آیا ہوں کہ اپنی آنے والی نسل کو جاگیردار کی غلامی سے بچا کر علم کی زیب و زینت سے سجا سکوں اور زیب النساء! تم میری زندگی کے اس مقصد میں میری معاون و مددگار ہو۔ یہ بات کبھی بھی نہ بھولنا۔"

اس نے اپنی دو سالہ بیٹی سارا کو اٹھا کر گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"آج تم میرے ساتھ مل کر عہد کرو کہ میرے بچوں کو کبھی بھی علم کی میراث سے محروم نہیں کرو گی۔ چاہے میری زندگی ساتھ دے یا نہ دے۔"

"خدا نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو، میں سہاگن آپ کے ہاتھوں میں سہاگن مروں۔" وہ بول اٹھی۔

احمد علی نے اس کو پریشان ہوتے دیکھ کر بات بدل دی۔

"ماسٹرانی بنو گی؟"

"میں؟" اس نے حیرت سے شوہر کو دیکھا۔

"ہاں تم، اس سے تمہاری تنہائی اور اجنبیت بھی ختم ہو گی۔ سب سے بڑی بات تمہیں بچوں کی تعلیم و تربیت کا شعور آ جائے گا۔"

"مگر گاؤں والے کیا کہیں گے؟" اس کے خدشات زبان پر آ گئے۔

"گاؤں کو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں' تبدیلی کا خواب لیے۔ اگر ہم شہر میں رہ کر تبدیل نہ ہو سکے تو گاؤں کو کیسے تبدیل کر سکیں گے۔ کبھی بھی لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرنا' ان کی باتوں پر کان دھرو گی تو سفر رک جائے گا' منزل دور ہو جائے گی۔"

اس دن اس نے اپنے سہاگ کے دوپٹے میں شوہر سے کیا گیا عہد باندھ لیا۔ تبدیلی کا' ظلم کے خلاف آواز حق بلند کرنے کا عہد۔



احساس ندامت انسان کی سچائی کی علامت ہے' ندامت انہیں ہی ہوتی ہے' جن کے ضمیر زندہ ہوتے ہیں۔ جو ازالے کی کوشش' کفارے کی سعی شروع کرا دیتی ہے۔

ندامت گناہوں کو دھو ڈالتی ہے' جہنم کا ایندھن بننے سے بچا کر جنت کے باغوں میں لا ڈالتی ہے۔

ندامت سزا سے پہلے دل میں جاگ اٹھے تو سزا جزا بن جاتی ہے۔

ندامت آنسوؤں کا خراج لیتی ہے اور بخشش کا سامان مہیا کرتی ہے۔ دنیا میں عزازیل کے بعد ہر آنے والے ظالم' شداد' نمرود و فرعون و ابو جہل نادم نہ ہونے کی وجہ سے ہی ذلیل و خوار ہوئے۔

ندامت آدم کے سر پر بخشش کا تاج پہنا دیتی ہے۔ ندامت عمر بن خطابؓ کو فاروق اعظم بنا کر امیر المومنین خلیفۃ المسلمین بنا دیتی ہے۔ ندامت اگر حکمرانوں کو میسر آجائے تو انہیں فاروق ثانی بننے میں دیر نہیں لگے گی مگر وہ نادم ہو شرمسار ہوں تو سہی۔

وہ نادم بھی تھا تو شرمسار بھی مگر باوجود ندامت کے وہ اپنے گناہ کا نہ کفارہ ادا کر سکا تھا نہ ازالہ' کیونکہ یہ گناہ اس نے بندے کی حق تلفی کا کیا تھا۔ حقوق اللہ کے زمرے میں آتا تو حسن ظن کی بنا پر بخش دیا جاتا مگر حقوق العباد میں کوتاہی بندے کی معافی سے مشروط تھی۔

وہ کیسے ان سے جا کر معافی مانگتا' اسے تو نفرت کا اژدھا نگلنے کو تیار تھا۔

وہ مجرم کی طرح منہ چھپائے پھر رہا تھا' سالوں پہلے جو بے وفائی کا داغ اپنے دامن پہ لگایا تھا' وقت کی دھول نے وہ داغ معدوم نہیں اور نمایاں کر دیا تھا۔ وہ اسے مٹانا چاہتا تو بھی مٹا نہیں سکتا تھا کیونکہ جس کے ساتھ بے وفائی کی اس کو بچے کی سوغات دے کر آیا تھا۔

باپ کے بلاوے پہ گاؤں پہنچا تو اس کے باپ نے اپنے دوست کی بیٹی سے رشتہ طے کرنے کے بارے میں اس کی رائے پوچھی۔

خوبصورت' پڑھی لکھی' باپ کی جاگیر کی اکلوتی وارث۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے فوراً رضامندی دے دی۔ پندرہ دن کے اندر اس کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی کیونکہ اس کا بیمار سسر بیٹی کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔

اور اگر ان کو مریم کے بارے میں پتا چل جاتا تو سب کچھ ختم ہو جاتا۔ اس نے یہ سب بچانے کے لیے مریم کے ساتھ سارے ناتے توڑ دیے۔ گھر جا کر مہر علی شاہ کو بقیہ پیسے دیے اور گھر خالی کرنے کا وعدہ کر آیا۔ طلاق نامہ تیار کروا کر بھجوا دیا۔ اسے پتا تھا وہ اس کے اصلی پتے سے ناواقف تھی۔ اس کے پیچھے کبھی بھی نہیں آسکتی تھی۔ خطرہ ٹل چکا تھا۔ سو وہ اپنی زندگی میں مگن ہو گیا' وہ بھول چکا تھا مریم کو اور یہ بھی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور اس بچے کا باپ ہونے کے ناتے وہ بچہ اس کی بھی ذمہ داری ہے مگر پہلی بار اس کو تب خیال آیا' جب ہاسپٹل میں اس نے اپنی بچی کو گود میں لیا۔ ریمسائی نے کہا تھا۔

"مبارک ہو' آپ باپ بن گئے۔"

ضمیر نے پہلی بار چٹکی کاٹی تھی۔

"باپ تو تم ڈیڑھ سال پہلے بھی بنے ہو گے' تب نہ تم نے مبارک باد وصول کی اور نہ ہی اپنے بچے کو اٹھایا۔"

اس نے بڑی شدت سے اس خیال کو جھٹکا اور ریمسائی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

دوسری بار مریم اور اس کے بچے کا خیال اسے تب آیا' جب چند سال کے بعد باوجود علاج کرانے کے اس کی بیوی کو لیڈی ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا کہ اب وہ ماں نہیں بن سکتی۔

بیٹے کی خواہش اس کے اندر مر گئی تھی' تب اسے شدت سے خیال آیا تھا۔ پتا نہیں مریم نے بیٹی کو جنم دیا یا اس کے ہاں بیٹا ہوا ہو گا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اچھا انسان نہیں ہے جسے یہ بھی پتہ نہیں' اس کی نسل نے اس کے اندر پنجے گاڑے تو وہ بے چین ہو اٹھا مگر وہ کس سے پوچھتا؟ کہاں جاتا' سوائے مریم کے گاؤں کے۔ وہ مریم کے گاؤں گیا تھا مگر اس کے عزیزوں کو بھی آج تک اس کا پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ کہاں گئی' کس کے ساتھ گئی' زندہ ہے یا مر گئی۔ آسمان نگل گیا یا زمین کھا گئی۔

اس کے گاؤں میں یہ تاثر عام تھا کہ بھائیوں کی مار سے تنگ آکر اس نے نہر میں کود کر خودکشی کر لی۔ وہ ناامید وہاں سے واپس آگیا تھا مگر ایک چبھن تھی' جس نے دل کا اک کونا پکڑ لیا تھا۔



"مس ماروی! خدا کرے آپ کے اندر ہمیشہ خوشبو کا شہر آباد رہے۔"

"کون سی خوشبو کا شہر' گلاب یا چنبیلی کا؟" وہ مسرور ہو کے مسکرائی۔

"خوشبو کا شہر محبت کا شہر ہے' جس کے آباد ہونے سے انسان کا ظاہر و باطن مہک اٹھتا ہے۔ وجود خاکی معطر ہو جاتا ہے۔ باقی خوشبوئیں تو عارضی ہیں' فوراً ختم ہونے والی۔" اس نے جام شورو کی فضاؤں میں ایک لمبی سانس لی اور صحن میں ٹہلنے لگی۔

جام شورو کی ٹھنڈی ہوائیں سرد سی ہو گئی تھیں۔ سرمئی بادل اتر (شمال) سے اڈے چلے آرہے تھے۔

سرد ساگی محبت سے آشنائی کا پہلا نام اور احساس جس کا خیال اس کی ہمرکابی میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کی یاد کا مور' دل کے کارونجھر پہ ہر وقت بیٹھا رہتا۔

اس کے پیار کا پرندہ سندھ دھرتی جیسی وسعت کے ساتھ دل کی دھرتی پر اڑانیں بھرتا رہتا۔ وہ خاموشی سے اس کی لمبی لمبی اڑانیں دیکھتی رہتی۔

وصل کی خواہش دل کو باندھ لیتی' آنکھیں بند کرتی تو اس کے سپنے جاگ جاتے۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھولتی تو اس کا خیال ساری خوبصورتیاں سمیٹ کر اس کے سامنے مسکرانے لگتا۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں اس کی یاد کا بادل برس کر سیلاب پیدا کرتا رہتا۔

اور ساون تو موسم ہی محبوب کی یاد کا تھا' اس موسم میں محبوب کو دیکھنا اور سننا بھٹائی کے بیتوں کی طرح ہی دلکش تھا۔

"کہاں ہے وہ' اس وقت کراچی کے کس گوٹھ میں سروے کر رہا ہے؟" اس کا خیال آیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ یہ بھی محبت کی ادا ہے کہ وہ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ بے چین رکھتی ہے۔

سیل فون کی آواز پر فون اٹھانے کمرے میں آئی۔ اسکرین پہ سرد ساگی کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے فوراً میسج کھولا۔

سجن ساعت ہیکڑی جے بچھے اکھیوں دھار
تہ کر سبھ جمار' ڈٹھو ہیں نا کڈھیں

(سجن! اگر ایک ساعت بھی تم آنکھوں سے الگ ہو جاؤ تو ایسا لگتا ہے جیسے ساری عمر تمہیں دیکھا ہی نہیں۔)

دسویں صدی ہجری کے شاعر شاہ بھٹائی کے پڑدادا شاہ عبدالکریم بلڑی والے کے بیت میں ساگی نے اپنے دل کی کیفیت لکھ بھیجی تھی۔

اس کے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ اٹھکھیلیاں کرنے لگی۔ اس نے چند لمحے آنکھیں موند کر سرشاری سے سوچا پھر شاہ کریم کی زبان میں ہی جواب ٹائپ کیا۔

پتیاری سر بٹڑو' جرتے پکھی جنئیں
اساں سجن تہنئیں' رہیو آہے روح میں

(جیسے پانی بھرنے والی عورت کے سر پر دوہرے مٹکے اس کے جسم کا ہی حصہ لگتے ہیں۔ جیسے پانی کا پرندہ پانی سے الگ نہیں ہو سکتا' ایسے ہی تیرا بسیرا میری روح کے اندر ہے۔)

شاہ کریم نے پرندے و پانی کا تذکرہ کیا ہے۔ پانی کے بغیر زندگی نہیں' ایسے ہی تمہارے بنا میری زندگی نہیں ہے۔ میری حیات کی ضامن تمہاری محبت ہے۔ سرمد! میں تمہارے بنا کچھ بھی نہیں' تو ہے تو میں ہوں۔"

مرو کی سائبانی پر اس کا یقین گہرا ہو چکا تھا۔ اسے سجاد علی کے واقعہ کے بعد احساس ہوا تھا کہ کسی مرو کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ سرمد سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو سالوں سے اس کو چپ چاپ چاہتا آیا تھا۔ باوجود اس کی نفرت کے حوالے عزت سے مانگ رہا تھا۔

اس نے محبت کے طویل سالوں میں کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی تھی۔ ماروی کے دل میں اس کی قدر تو تھی' محبت بھی۔ شاید کسی کونے میں چھپی ہوئی تھی' جو فورا" باہر نکل آئی۔

وہ کبھی کبھی اپنی اس کیفیت پہ بڑی حیران ہوتی' جھنجلاتی۔ کیا ہو گیا تھا اسے' وہ ہر وقت اسے ہی سوچتی رہتی۔ ہر منظر ہر جگہ اسے وہی دکھتا تھا۔

سرمد کو اس کے اخبار کی طرف سے کراچی آفس بھیج دیا گیا تھا۔ وہ وہاں خصوصی فیچر پر کام کر رہا تھا اور اس کی جان جیسے سولی پر اٹک گئی تھی۔

پتا نہیں کیوں محبت میں آدمی ہمیشہ ہراساں رہتا ہے۔ دل کو دھڑکا سا لگا رہتا ہے' بچھوڑے کا' جدائی کا۔ کراچی پوسٹنگ سے پہلے سرمد آیا تو اس نے برملا اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔

وہ چند لمحے لب بھینچے اسے دیکھتا رہا بغور۔

"آس... تراس... ہراس... محبت میں دل ان ہی میں گھرا رہتا ہے۔" وہ رک رک کے بولا تھا۔

"کیا مطلب؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرے خیال میں کسی محبت والے دل کو ان کے معنی بتانا بے معنی ہے۔" وہ ہنسا تھا اور دل کھول کر ہنسا تھا۔

اسے لگا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس نے گھور کر سرمد کو مصنوعی خفگی سے دیکھا تھا' جو اسے شرارتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

تب اس نے اسے اپنا بہت سارا خیال رکھنے کی تلقین کی تھی اور اس نے اس کے سامنے ایسے ہی سر خم کر لیا تھا' جیسے رائے ڈیاچ نے بیجل کے سامنے۔

☼ ☼ ☼

جمہوریت کی بساط لپیٹ دی گئی تھی۔ ملک کے اندر ایک سکوت و سناٹا تھا۔ یہ پہلی بار تو نہیں ہوا تھا کہ عوام کے بنیادی حق پر ڈاکہ ڈالا گیا ہو۔ عوام سہمے ہوئے تھے۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے اور ایک آمر کی طاقت کی آخری حد آخر کیا ہو گی؟

وہ کچھ عرصے تک حالات کا گہرائی سے جائزہ لیتا رہا' جب لیور کھینچا جا چکا تو وہ رہ نہیں پایا' اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ ہمارے ووٹوں سے منتخب ہوا تھا' اگر اس کی پالیسیاں غلط بھی تھیں تو یہ حق بھی ہمیں تھا کہ ہم ایک بار پھر اپنے ووٹ سے اس کا فیصلہ کرتے۔ ایک آمر کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ عوامی لیڈر کے مقدر کا فیصلہ کرے' اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کرے' اس سے زندگی چھین لے۔ آمر نے عوام کو ذلیل کیا ہے اور اس کی طاقت اور اختیار کو بوٹوں تلے روندا ہے۔"

نوٹس دیے گئے کہ سرکاری ملازم سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتے مگر اس کے اندر کی سرکار' آمر کی سرکار سے جیت گئی۔

وہ احمد علی تھا جس نے جاگیردار کی غلامی قبول نہیں کی تو جنرل کی کیسے کر سکتا تھا اور نتیجتاً" ایک دن اس کو پکڑ کر تھانے میں بند کر دیا گیا۔

پندرہ دن تک اس کی خوب مہمان نوازی اور آؤ بھگت ہوتی رہی۔ پندرہ دن بعد حوالات کی سیر کر کے وہ لڑکھڑاتے قدموں سے زخموں کو سہلاتے گھر پہنچا تھا۔

زیب النساء اس سارے عرصے میں پریشانی سے کبھی اس کے دوستوں سے رابطہ کرتی' کبھی گھر والوں سے تو کبھی تھانے جاتی مگر وہاں ایک بار بھی اس کی ملاقات نہیں کروائی گئی۔ ہر بار صوبیدار اسے اپنے شوہر کی زبان بند کرنے کو کہتا رہا۔ وہ اپنے جگری یار رئیس غلام مرتضیٰ کی بھاری رشوت کے عوض رہا ہو کر آیا تھا۔ آیا تو گاؤں سے اس کا باپ بھی آیا تھا مگر اس کی کسی نے نہیں سنی کیونکہ سردار آمر کا حمایتی تھا اور اس نے اپنے کمہار کے اس انقلابی بیٹے کی سفارش سے انکار کر دیا تھا جس نے اس کی غلامی قبول نہیں کی تھی۔

"تو واپس چل احمد علی! بابا ہمارا وڈیرے کے بغیر گزارا نہیں۔ کیوں اپنی جان سے کھیل رہا ہے۔" دھنی بخش نے اس کا چہرہ چوم کے کہا۔

"ہاں یار! تو اکیلا اس فرسودہ نظام سے نہیں ٹکرا سکتا۔ چاچا دھنی بخش بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔" مرتضیٰ کی تائید پر اس نے چند لمحے کے سکوت کے بعد بہت مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں بزدلوں کی طرح چپ نہیں رہ سکتا' ظلم جہاں ہو گا میں بولوں گا اور لڑوں گا۔"

"تو چل احمد علی! تو چل واپس۔ بابا مان لے میری بات۔ کیوں سیدھا راستہ چھوڑ کے مشکل راستہ چنتا ہے۔ نہ چل اس راہ پہ بابا پٹ! (بیٹا) نہ چل۔"

کمہار دھنی بخش آبدیدہ ہو گیا' اپنے پٹکے (پگڑی) کے پلو سے نم آنکھیں پونچھیں۔

"بابا! یوں التجا کر کے مجھے گناہ گار تو نہ کریں۔" اس نے سارا اور ثوبیہ کو نظر بھر کے دیکھا۔ "میں اپنی بچیوں کا مستقبل اندھیر نہیں کر سکتا۔ میری یہ بیٹیاں اور میرا سرمد میں ان کی تعلیم و تربیت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا نہ ہی مجھ سے ظالموں کی غلامی بھری جائے گی۔"

اس کے پر عزم قطعیت سے کہنے پر اس کا باپ مایوسی سے لوٹ گیا۔

چند دن بعد جب زخموں میں درد کچھ کم ہوا تو وہ سندھ مسلم کالج پہنچا' پرنسپل نے اس سے کہا۔

"آپ سیاسی سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے ہیں' اس لیے آپ کی نوکری ختم کر دی گئی ہے۔"

وہ بہت تحمل سے مسکرایا۔ "مجھے یہ اطلاع مل چکی تھی' میں نے سوچا یہ آرڈر میں خود وصول کروں کیونکہ بہرحال یہ بھی آمریت کا تحفہ ہے۔"

وہ استہزائیہ انداز میں کہہ کر ہنسا۔

"احمد علی! تم محتاط رہتے تو بہتر تھا۔" پرنسپل نے اس سے ہمدردی جتائی۔

"سر! میں محتاط اس لیے نہیں رہ سکتا جبکہ ہم بائیس گریڈ کے آدمی کے محکوم نہیں رہ سکتے کہ وہ ہمیں۔۔۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "کوڑے لگوائے' جیل بھجوائے اور ہمارے حق حکومت' حق رائے دہی پر ڈاکہ ڈالے۔"

"تم باز نہیں آؤ گے۔ بہرحال مجھے افسوس ہے تمہاری جاب کے جانے کا۔"

"فکر نہ کریں سر! روزی رزق دینے والے نے رزق لکھ دیا ہے قسمت میں۔ کہیں نہ کہیں سے ضرور دے گا۔" تیرہ سال بعد اس کالج سے وہ ہمیشہ کے لیے اٹھ کر آ گیا۔

کچھ ہی عرصے بعد زیب النساء کی جاب بھی جاتی رہی۔ وہ پریشان تو ہوا مگر ہمت نہیں ہاری۔

دونوں اپنی جمع پونجی کو احتیاط سے خرچ کر رہے تھے۔ آگے اللہ مالک تھا۔ وہ اکثر پریشان متفکر بیٹھی' زیب النساء سے کہتا۔

"آمر سے اللہ بڑا ہے۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ آ جاتی۔

کچھ ہی عرصے بعد اسے ایک اخبار میں اسٹاف رپورٹر کی جاب مل گئی اور اس کا قلم رواں ہو گیا۔ جاب کے ساتھ ساتھ وہ آرٹیکلز بھی لکھتا رہا۔ اس کے قلم کی چبھن صاحب اقتدار کے لیے ناقابل قبول تھی۔ بالآخر دو سال بعد حکومتی پریشر پر اس جاب سے بھی اسے فارغ کر دیا گیا۔ وہ پریشان ضرور ہوا مگر مایوس نہیں ہوا۔

"اب کیا ہو گا؟" زیب النساء پھر متفکر ہوئی۔

"اللہ چنگی کرے گا۔" وہ سر کو بازو کے نیچے کیے بولا۔ حق اور سچ پر چلنا بہت کٹھن تھا۔ اس کے بہت

سارے ساتھی دوست ضمیر بیچ کے خودداری کا سودا کرکے بہت ساری مراعات لے چکے تھے۔ سارا پانچویں میں تھی تو یہ دوسری کلاس میں جبکہ سرد نے ابھی اسکول جانا شروع کیا تھا۔ اس کے بچوں کے مستقبل کا سوال تھا۔ وہ آرام سے بے پیار کے نہیں سو سکتا تھا۔ سو دوسرے دن سے ملازمت کے حصول کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ دو ماہ بعد اس کی محنت رنگ لائی۔ ایک پرائیویٹ فرم میں اس کو سپروائزر کی جاب مل گئی۔ تب جاب حاصل کرنے کے لیے کراچی کے ڈومیسائل کی شرط نہیں تھی۔

اس کی خاموشی کا عرصہ دو سال پر محیط رہا پھر وہ گم نام کے نام سے طنز و مزاح کا کالم لکھنے لگا۔

کچھ ہی عرصے بعد غیر جماعتی بنیاد پر الیکشن ہوئے تھے اور نئی حکومت نے تعلیم بالغان کے تحت نئی روشنی اسکول کی بنیاد ڈالی تھی۔ مرتضیٰ کی کوشش سے زیب النساء کو وہاں جاب مل گئی تھی۔ ان کے شب و روز میں بڑی حد تک ٹھہراؤ آچکا تھا۔ وقت بدحالی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

آمریت کے بادل ابھی چھٹے نہیں تھے مگر لولی لنگڑی جمہوریت بھی آمر سے برداشت نہیں ہوئی' آٹھویں ترمیم کی تلوار سے اسمبلیاں قتل کر دی گئیں۔ آمر کی گود میں لے پالک بیٹھے رہے اور سندھڑی کا وزیر اعظم چلا گیا اور کچھ وقت سرکنے کے بعد ایک دن اس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔

"وقت کا فیصلہ بڑا عجیب ہوتا ہے۔ وقت طاقت ورول ---- کو کمزور اور کمزوروں کو طاقت ور بنا دیتا ہے۔ یہ وقت کا فیصلہ اور قدرت کا انصاف ہے کہ ہم سب کو ایک دن اس کے پاس جانا ہے۔ محلات و ملکیت کے باوجود بے سروسامان حاضری دینا ہے۔ شاہی سواری کے باوجود دوسروں کے کاندھے پر سوار ہو کے جانا ہے۔ سب کچھ چھوڑ کے تنہا اس کے پاس پہنچنا ہے۔

ہمیشگی کی بادشاہی صرف اس کی ذات کا حصہ ہے۔ سارے بادشاہ دارا و سکندر بادشاہتیں چھوڑ کر خالی ہاتھ اس کی دربار میں پہنچتے ہیں اور خالی صندوق بھی مٹی میں مدفون ہوتے ہیں۔ آمر خود موت کا رزق بن گیا تھا۔

اور پھر سازشوں میں گھرا جمہوریت کا زرد و کمزور سورج طلوع ہو ہی گیا۔ اس کا قلم پوری آزادی سے لکھنے لگا۔ وہ گم نام سے نام والا بن گیا مگر تھوڑے ہی عرصے بعد جمہوریت دشمن عناصر نے جمہوریت کو ناکام کرنے کے لیے کراچی کے امن کو تہ و بالا کر دیا۔ اندھی گولیوں کے شکار بوری بند نعشوں کی صورت ملنے لگے۔

بنیادی طور پر وہ کسی بھی سیاسی پارٹی کا کارکن نہیں تھا۔ اس کی وابستگی صرف حق کے ساتھ تھی اور مظلوم کے ساتھ تھی۔ وہ سرمایہ داروں' جاگیرداروں' عیش پرست اعلا افسران اور آمریت کا مخالف تھا۔ پاکستانی عوام جو ان کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے' ان کے جائز بنیادی حقوق کی بات کرتا تھا۔ جمہوریت کو ناکام کرنے والوں نے سندھ کے دیہاتوں میں نعشیں بھیج کر جمہوری حکومت کو ناکام کرنے کی کوشش کی۔ ان نعشوں میں ایک نعش انقلابی سوچ رکھنے والے احمد علی سانگی کی بھی تھی۔

احمد علی کی موت صرف احمد علی کی موت نہیں تھی' یہ ایک خواب کی موت تھی' ایک سپنے کی موت تھی' ایک احساس کی موت تھی۔ ایک تبدیلی کے خواہاں کی موت نے سب کو خون کے آنسو رلا دیا تھا۔

اس کی موت کی خبر جس جس جاننے والے تک پہنچی وہ تڑپ اٹھا' ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ کیا جمہوریت پسند ہونے کی سزا میں انہیں نعشوں کے تحفے مل رہے ہیں۔ سندھ کی سرزمین پہ کیسا برا وقت آیا تھا' اس کے شہر اس کے باسیوں کے لیے مقتل بن گئے تھے۔ بھٹائی کی نگری اور شہباز کے دیس کے لوگوں کے ذہنوں میں ایک ماتمی لہر تھی' جو صوفیا کی سرزمین پر چھا رہی تھی۔ ایک خوف کی فضا نے پورے سندھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

مرتضیٰ اس کی شہادت کی خبر پر فوراً حیدر آباد سے کراچی پہنچا تھا۔ گاؤں والوں کو اس نے وڈیرے کے

شہر والے بنگلے پر فون کر کے اطلاع کے ساتھ آنے سے بھی منع کر دیا۔ وہ غم سے نڈھال زیب النساء کے پاس آیا تھا۔

"بھاجائی! یہاں کے حالات ایسے نہیں کہ آپ تنہا عدت کی مدت گزار سکیں۔ بہتر ہے کہ آپ بچوں سمیت گاؤں چلیں۔"

وہ خاموشی سے سر جھکا کے روتی رہی۔

"آپ کے بچے چھوٹے ہیں' سرد ابھی پانچویں میں ہے۔ اتنے چھوٹے بچے کے ساتھ آپ رہ ہی نہیں سکتیں۔"

وہ احمد علی کی لاش کو تکتے ہوئے سسک پڑا۔ کیا قصور تھا اس کے اس دلیر دوست کا۔ نظام سے بغاوت حق کی تحریر' سچ کی سوچ' امن کی طلب۔ یہی نا! جس کی سزا میں اس کو موٹر سائیکل پر بیٹھے نقاب پوش دہشت گردوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اپنے ہی گھر کے سامنے' صبح آفس کے لیے نکلتے وقت' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تب زیب النساء نے روتے روتے اثبات میں سر ہلا کر گاؤں واپسی کی رضامندی دے دی۔ ان کی واپسی بڑی دکھی کرنے والی حقیقت تھی۔ وہ لاش لے کر واپس لوٹے تھے تب ایمبولنس میں بیٹھ کر زیب النساء نے احمد علی کے حق کے لیے لکھنے والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر وچن (وعدہ) کیا تھا۔ اس کے خواب کو تعبیر دینے کا عہد کر کے اس کی مردہ آنکھوں سے اس کا خواب چرا لیا تھا۔

پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس نے وہ خواب سرد کی آنکھوں میں رکھ دیا تھا۔



شروع شروع کی محبت میں اظہار محبت کا جزو لازم بن جاتا ہے۔ یہ منہ زور دریا ہوتا ہے' جو ہر بند توڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ کتنے بھی بند باندھے جائیں مگر کہیں نہ کہیں سے وہ راستہ بنا لیتا ہے۔ وہ ایک بند باندھتا ہے تو دوسرا ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اس کو بند کرتا ہے تو تیسرے بند سے پھوٹ نکلتا ہے۔ محبت میں ضبط کا قرینہ بہت دیر میں آتا ہے۔ محبت میں جتنی گہرائی ہوتی ہے اتنی ہی خاموشی ہوتی ہے۔ اسے بھی اپنی محبت پر ضبط کا بند باندھنے کا ہنر آگیا تھا۔

وہ کراچی سے صرف چند گھنٹوں کے لیے اس سے ملنے آیا تھا۔ کراچی کے قدیم گوٹھوں کا سروے ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس نے فیچر کی ایک قسط بھیج دی تھی۔ وہ سنڈے ایڈیشن میں لگنا تھی۔ ابھی بقیہ دو اقساط مکمل کر کے اسے اپنے اخبار کو بھیجنا تھیں۔

"تم آجاؤ سرد! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

ماروی کے تیسرے میسج پر اس نے کوچ کا ٹکٹ لیا اور تین گھنٹوں بعد اس کے سامنے آبیٹھا۔

وہ اس کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے گنگ ہو گئی تھی۔ اپنی اس بے بسی کی کیفیت پر اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ سامنے بیٹھے سرد سانگی کا عکس دھندلا پڑنے لگا اور عکس دھندلا صرف اس کا ہی نہیں ماروی کا بھی پڑنے لگا تھا۔

محبت کرنے والے جب محبت کی عروج پر پہنچتے ہیں تو ان کی کیفیات ایک دوسرے سے منسلک ہو جاتی ہیں۔ اس سے جب دونوں کی بھیگتی آنکھوں اور دھندلے عکس کو دیکھ کر محبت نے بڑی مضبوطی سے ان کو باہنوں میں لے لیا۔

"ماروی! اب مجھے لگتا ہے کہ مجھے اپنی محبت کے جولب میں وہی شدتیں چاہئیں جو میرے اندر ہیں۔"

ماروی نے اک نظر اس کے محبت سے منور چہرے پر ڈالی اور نظر جھکالی۔

"یک طرفہ محبت جبری مشقت کی طرح بڑی کٹھن رہی ہے میرے لیے۔ تم نہیں جانتیں یہ کتنی تھکا دینے والی' کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔ کتنا جبر کرنا پڑتا ہے خود پہ' احساسات پہ' خواہشات پہ۔" وہ خاموش ہو گیا تھا' ان دونوں کے درمیان ایک بھید بھری چپ چھا گئی تھی۔

ماروی کو شدت سے اپنی بے زبانی کا احساس ہوا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

عشق کے بادشاہ بھٹائی کا بیت اس کی یادداشت میں وارد ہوا اور اظہار نے اس کی زبان کا کونا پکڑلیا۔

نین نہ ننڈوں کن بھگو آرس اکھین
اجھا میو برن' تو کھے سارئو سپرین

(نین تمہاری یاد کی شدت سے نیند نہیں کر لیتے۔ تمہیں یاد کر کے میرے محبوب گل ہوتی آنکھیں جل اٹھتی ہیں۔)

جل اٹھنا یاد سے جل جانا تھا یا خوشی سے روشن ہونا تھا۔ احساس کوئی بھی تھا مگر خوبصورت تھا۔ یہ بات سرد سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ اتنا خوبصورت اظہار سن کر کراچی سے جام شورو تک آنے کی تھکن ایک لمحے میں ختم ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

گھاؤ بہت بڑا تھا مگر ہر گھاؤ کو وقت اور مقصد بھر دیتا ہے۔ وقت تو اتنا نہیں گزرا تھا مگر اس کے سامنے جو مقصد تھا' اس نے اس کو اٹھنے کی قوت بخش دی۔ احمد علی کی موت بہت بڑا صدمہ تھا اس کے لیے۔ نہ صرف خود سر اٹھا کر جینا تھا بلکہ دوسروں میں بھی آزادی سے جینے کی امنگ پیدا کرنی تھی۔

اس کی ناگہانی موت کا دکھ سارے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باپ کمدار دھنی بخش کو بیٹے کی موت نے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ عدت ختم ہونے کے دوسرے دن کمدار دھنی بخش کے پاس گئی تھی۔

"آجاؤ میری اماں! کیسی ہو دھیڑی (بیٹی)۔" کمدار نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"چاچا! میں چاہتی ہوں کہ یہاں لڑکیوں کا اسکول ہو۔" وہ چارپائی کے کونے پر ٹک گئی۔

"دیکھو بیٹا! یہ میرے بال سفید برف جیسے ہو گئے ہیں۔ میری کمر دوہری ہو گئی ہے۔ میرے تجربے کا یقین کرلو' یہاں نظام تبدیل ہو ہی نہیں سکتا۔ شہر ہو یا دیہات' اس ملک میں استحصالی قوتیں ہر جگہ برسرپیکار ہیں۔ وہ احمد علی جیسے لوگوں کو کبھی قبول نہیں کرتیں۔ میرے احمد علی کو کیا ملا' تمہیں تو پتا ہے نا مجھ سے زیادہ کہ اس نے زندگی کتنی مشکل سے گزاری۔ ہر جگہ اس کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے اور بالآخر سچ بولنے' حق لکھنے کی پاداش میں اس کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔"

اس کے لب بیٹے کے ذکر پر کانپنے لگے۔ اس نے اجرک کے پلو سے آنسو پونچھے۔

شوہر کے ذکر پر اس کا زخم ہرا ہو گیا۔ اس نے آنکھوں میں آنے والے آنسو بڑے ضبط سے پی لیے۔

"چاچا! میں احمد علی کے مقصد کو مرنے نہیں دوں گی۔ میں اس کے مقصد کی جدوجہد میں اس کے خون کو رائیگاں ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"میں تو اس لیے کہہ رہا تھا بیٹا! کہ یہ مشکل کام ہے' جان جوکھم میں ڈالنے والا۔ تیری بیٹی جوان ہو گئی ہے' اس کی شادی کا سوچ۔" کمدار نے کمزور آواز میں کہا۔

"نہیں چاچا! میری بیٹی نے ابھی صرف میٹرک کیا ہے' اسے میں آگے پڑھاؤں گی۔"

"مگر وہ شہر پڑھنے کیسے جائے گی؟"

"آپ پریشان نہ ہوں چاچا! احمد علی نے مجھے پڑھائی کا سلسلہ ختم کرنے ہی نہیں دیا۔ میں نے گریجویشن کی ہے۔ میں اسے خود پڑھاؤں گی۔ صرف امتحانات کے دنوں میں اسے شہر جانا پڑے گا۔ میں خود اس کے ساتھ جاؤں گی۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

"میں آپ سے اسکول کے لیے پلاٹ مانگنے آئی ہوں۔ میں نے اول کو پیغام بھجوا دیا ہے۔ کل میں علاقے کے ایم پی اے سے ملنے جا رہی ہوں۔ اگر یہاں میں اسکول نہ کھول سکوں گی تو میرے پاس پھر صرف ایک راستہ ہے' کراچی واپسی کا۔"

کمدار دھنی بخش اس کے مضبوط ارادے کے آگے ہار گیا۔ بھینسوں کے باڑے کے پچھواڑے بڑا پلاٹ اسکول کے لیے دے دیا۔ دوسرے دن وہ اول کے ساتھ علاقے کے ایم پی اے کے گاؤں پہنچی۔

وہ شہید احمد علی کی بیوہ تھی' احمد علی کی تعزیت۔ یہی ایم پی اے کرنے اس کے پاس آیا تھا۔ نام بتانے پر فوراً" اس کو آفس بلوا لیا گیا۔ اس نے اسکول کی درخواست ایم پی اے کے سامنے رکھی۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے جب الیکشن جیتنے کے بعد احمد علی مجھے مبارک باد دینے آیا تھا۔ تب اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا دیرینہ خواب پورا کر دیں اور میرے گاؤں میں پرائمری اور ہائی اسکول بنا دیں۔ میں نے وعدہ کیا اور پورا کر کے دکھایا۔ آج مجھے خوشی ہے کہ آپ لڑکیوں کے اسکول کے لیے میرے پاس آئی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تین ماہ میں یہ اسکول دینا میری ذمہ داری ہے۔"

وہ بہت خوش ہو کے واپس لوٹی تھی۔ گاؤں کی کچی پگڈنڈی جس کو پکی کروانے کی منظوری احمد علی نے دلوائی تھی۔ اس پر کام جاری تھا۔

طویل جبر کے بعد لوگوں کو کچھ آکسیجن جمہوریت نے فراہم کی تھی مگر اس کے خلاف سازشی ٹولے متحرک ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ لینڈ مافیا کی طرف سے مسمار کیے گئے قدیم سندھی کوٹھوں پر فیچر مکمل کر کے واپس لوٹا تو جیسے ماروی کی جان میں جان آگئی۔

وہ آفس میں رپورٹ دے کر اس سے ملنے آیا تھا اور اب گل کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ماروی کے ہاتھ کی بنی چائے پی رہا تھا۔

"سرد۔۔۔!" لمبی خاموشی کے بعد اس نے پکارا۔

"بولو ماروی!" وہ کافی دیر سے دیکھ رہا تھا' وہ کچھ کہنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر رہی تھی۔

"جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہہ دو' بلا جھجک۔" اس نے ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تمہاری منگیتر کا نام کیا ہے؟"

"سرو! مگر وہ میری منگیتر نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے وہ؟" اس نے مسکراہٹ کو کھینچ کے بمشکل ہونٹوں کے کونوں تک پہنچایا۔

"وہ میرے دادا کی کہی صرف ایک بات ہے اور کچھ نہیں' نہ روایت کے مطابق منگنی ہوئی نا مٹھائی بانٹی گئی۔ یہ بات تمہیں میں نے صرف اس لیے بتائی تھی کہ کسی اور سے یہ بات سنو تو تم غلط نہ سوچو۔ یہ بات تمہیں پریشان کر رہی ہے؟"

"کیا نہیں ہونا چاہیے؟"

"میرے خیال میں نہیں۔" اس نے لمبی سانس لی۔

"ہمارا رشتہ تو نا کس نگوید بعد ازیں من دیگر مرتو دیگری (تاکہ کوئی یہ نا کہہ سکے کہ تو الگ ہے میں الگ۔) والا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہیں ہی نہیں ماروی!"

وہ اسے مکمل یقین سے کہتے ہوئے مسکرا دی۔

"پھر تم نے وہ بات ختم کیوں نہیں کر دی؟"

"ہماری طرف سے تو سمجھو بات ختم ہی ہے۔ مہو خود ایسا نہیں چاہتی' وہ کسی کو پسند کرتی ہے۔ جب دادا نے یہ بات کی تو اماں ادی سارا کی شادی کر رہی تھی اول سے۔ دادا کو سخت اعتراض ہوا کہ گھر میں لڑکے ہوتے ہوئے وہ غیر برادری میں پوتی کی شادی نہیں کرنے دیں گے۔

میں تب آٹھویں میں تھا۔ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اماں نے دادا سے کہا کہ میں چاچا احسان کے بیٹے فدا حسین سے سارا کی شادی اس لیے نہیں کر سکتی کہ وہ سردار کا کمدار ہے۔ چاچا احسان کی بیماری کے بعد فدا حسین نوجوانی میں سردار کا کمدار لگ گیا تھا۔ یہ بابا کے اصولوں کے خلاف بات تھی۔ جس شخص نے ساری عمر وڈیروں' جاگیرداروں کی غلامی اور ان کے نظام کے خلاف جنگ کی ہے' اس کی بیٹی اسی نظام کے اک کل پرزے کو سونپ دی جائے۔

تب دادا نے یہ شرط رکھ دی کہ اگر تم اپنی بیٹیاں نہیں دینا چاہتیں تو تم از کم سرد کے لیے احسان کی لڑکی لے لو۔ امی مصلحتاً خاموش ہو گئیں کہ فی الحال ان کو اپنی دو بیٹیاں بیاہنی تھیں۔ میرے چاچا نے یہ بات مشہور

کردی۔ امی سے اگر کوئی بھی پوچھتا تو وہ کہتیں، جب بچے بڑے ہو جائیں گے تب دیکھیں گے۔"

وہ چند ثانیے کے لیے رکا۔

"تم نہیں جانتیں ماروی! امی کو وہاں اسکول چلانے اور بیٹیاں بیاہنے میں کتنی مشکلات پیش آئی ہیں۔ مگر اس نے مردانہ وار مقابلہ کیا حالات کا۔ ویسے ایک بات ہے، بعض دفعہ محبت میں بھی وضاحت دینا ضروری ہو جاتا ہے۔"

ماروی نے خجل ہوتے سرعت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارتی چمک دیکھ کر مسکرا دی۔

"ہاں تمہارے نام کے ساتھ کوئی اور نام لگے گا تو وضاحت تو مانگوں گی۔"

"اس ناچیز کے نام کے آگے ماروی کا نام ہی لگ سکتا ہے محترمہ!" اس نے سینے پر عاجزی سے ہاتھ رکھ کے جھک کے کہا۔

ان کو مسکراتے دیکھ کر زندگی بھی مسکرا اٹھی تھی۔



اس نے نوٹ کیا تھا کہ سرمد جب سے آیا ہے، کچھ بے چین اور پریشان ہے۔ اس نے اس دن بھی اس کو اتنا ہی پریشان دیکھا تھا، جب وہ ماروی کے گھر سے رشتے کی بات کیے بغیر اٹھی تھی۔

"تمہیں پتا ہے ماروی کی ماں کون ہے؟" اس کی ماں نے سرمد سے پوچھا تھا۔

سرمد نے حیرانی سے سر ہلایا تو اس نے بتایا۔

"وہ تمہارے انکل مرتضیٰ کی وہ بیوی ہے، جو اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ماروی کی نانی بھی جوان اولاد کو چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ مریم نے بھی بھائیوں کے طے کیے ہوئے رشتے کو چھوڑا اور مرتضیٰ کے پیچھے نکل آئی۔ میں نے اسے تب دیکھا، جب تمہارے بابا کے ساتھ گاؤں جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے ہم حیدر آباد میں مرتضیٰ کے گھر ٹھہرے تھے۔

ایک سال بعد جب مرتضیٰ کی شادی کا کارڈ آیا تو ہم حیران رہ گئے۔ تمہارے بابا کے پوچھنے پر مرتضیٰ نے بتایا کہ جس کو اس نے مظلوم سمجھ کر پناہ دی تھی، وہ اس کا ساتھ نہ نبھا سکی اور اسے چھوڑ کر بھاگ گئی۔ مرتضیٰ نے تمہارے بابا سے التجا کی تھی کہ اس کی اس خفیہ شادی کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد مریم کا نام ہماری زبان پر کبھی نہیں آیا۔"

"ہاں! آخر انکل نے یہ شادی خفیہ کیوں رکھی۔ آپ نے کبھی اس ایک نکتے پر نہیں سوچا؟"

"مرتضیٰ کا کہنا تھا کہ مریم کے بھائیوں کے ڈر سے اس نے شادی کو خفیہ رکھا ہے پھر وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی، تب بھی مرتضیٰ نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اسے کہیں نہیں ملی اور تم تو جانتے ہو مرتضیٰ کتنا اچھا ہے۔ صرف تمہارے بابا کی دوستی کی وجہ سے اس نے ہمارا کتنا ساتھ دیا ہے۔ وہ محبت کرنے والا، یار باش بندہ ہے بیٹا! اس عورت نے ہی اس سے بے وفائی کی تھی۔"

"ماں! اس جہاں میں کوئی بھی بندہ سب کے لیے اچھا یا سب کے لیے برا نہیں ہوتا۔ جو ہمارے لیے اچھا ہو سکتا ہے وہ کسی اور کے لیے برا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

سرمد نے اسے قائل کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

"مگر بیٹا! تم خود سوچو جو دوستوں کے لیے اتنا اچھا، مدد کرنے والا بندہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے لیے برا کیوں ہوگا جس کو اس نے پناہ بھی خود ہی دی ہو اور پتا نہیں ماروی اس کی بیٹی ہے بھی یا نہیں کیونکہ مرتضیٰ نے ایسا کوئی ذکر کبھی نہیں کیا۔"

سرمد کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا۔

اس نے محبت ماروی سے کی تھی، اس کے باپ یا حسب نسب سے نہیں۔ اس کی ولدیت مشکوک ہوتی رہے، اس نے تو اسے ذلتوں سمیت قبول کیا تھا۔ اب صرف اس بات پر چھوڑ دینا ممکن نہیں تھا۔

اس نے فوراً فون اٹھا کر رمیس مرتضیٰ کو بلایا تھا، وہ آدھے گھنٹے بعد آ گیا تھا۔

"ڈاڈا! آج ہم نے مریم کو دیکھا تھا۔" زیب النساء نے بات بہاؤ سے شروع کی۔

"کہاں؟ اس کی بیٹی ہے یا بیٹا؟" اس نے بے تابی سے سوال کیا۔

"بیٹی ہے انکل!" سارا نے سارے قصے میں پہلی بار زبان کھولی۔

"کیا وہ بیٹی آپ کی ہے؟" سرمد نے بغور اسے دیکھا۔

"ہاں، جب میں نے مریم کو طلاق دی تو وہ پریگننٹ تھی۔"

"طلاق آپ نے دی یا اس نے لی؟"

"سرمد بیٹا! طلاق میں نے اسے دی۔ میں نے ہی اسے چھوڑ دیا تھا لالچ میں آ کر۔ بعد میں جب مجھے احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ مریم کو میں نے بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ آج چھبیس سال بعد مجھے پتا چلا ہے کہ میری ایک بیٹی اور بھی ہے۔" اس کا لہجہ اور آنکھیں بھیگ گئیں۔

سرمد نے فون ملا کر اسپیکر آن کر دیا۔

"ماروی!"

"کہو، اب کیوں فون کیا ہے؟" سرمد نے اس کے تپتے لہجے پر فوراً کرب سے آنکھیں موند لیں۔

"تم جانتی ہو اپنے باپ کے متعلق؟"

"ہاں میں سب کچھ جان چکی ہوں۔"

"کیا اس سے ملنا چاہو گی؟"

"نہیں، قطعاً نہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو سرمد کہ میں اس شخص سے شدید نفرت کرتی ہوں۔"

"مگر وہ تمہارا باپ ہے ماروی! تمہاری ولدیت کے خانے میں اس کا نام ہے۔"

"ہاں، صرف ڈاکومنٹس تک اور تم جانتے ہو، ڈاکومنٹس میں ولدیت ضروری ہوتی ہے۔" اس نے فون بند کر دیا۔

ایک نفیس اور محبت کرنے والا انسان جو اپنی اولاد کے لیے قابل نفرت تھا، انہوں نے اسے بہت جھکے جھکے قدموں سے اٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔

سب لوگ خاموش تھے۔ زیب النساء کو احساس ہو کہ اس نے عجلت میں بیٹے کی بنی ہوئی بات کو بگاڑ دیا ہے اور وہ صرف رشتے کی تو بات نہیں تھی کہ اس جگہ نہیں تو کہیں اور سہی۔ وہ تو اس کے بیٹے کی محبت تھی اور اس نے ذرا خیال نہ کیا، کچھ نہ سوچا۔ ماروی کے گھر سے یوں اٹھ کے آتے ہوئے کہ اس کے بیٹے کی آنکھوں کی قندیلیں بجھ سکتی ہیں۔ اس کا دل مر سکتا ہے۔ وہ زندگی کی خوشیوں سے دور جا سکتا ہے۔

سب لوگ اپنی اپنی جگہ سناٹے میں آ گئے۔ چور سے بن گئے تھے۔

"سرمد! مجھے بتاؤ میری جان! میں کیا کروں۔ مجھے ابھی لے چلو، میں خود مریم سے، ماروی سے معافی مانگ لوں گی۔"

"نہیں اماں! ابھی نہیں۔" اس نے پشیمان سی ماں کے گرد بازو حمائل کیا۔ "آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ لہجے سے کتنی ڈسٹرب لگ رہی تھی۔ اس کے باپ کا دھوکا، رشتے سے انکار اور ماں نانی کی حقیقت بہت بڑے دھچکے ہیں اس کے لیے۔ میں پہلے اسے مناؤں گا پھر آپ اس سے معذرت کر لیجیے گا۔"

دوسرے دن زیب النساء دل پہ بوجھ لیے گاؤں واپس لوٹ آئی تھی۔

پھر کتنے ہی دنوں بعد جب سرمد نے اپنی محبت و سچائی کو اپنے قول و فعل سے ثابت کیا تو اس نے مریم اور ماروی کو فون کر کے معذرت کی اور اپنی غلط فہمی کی حقیقت بتائی تھی۔



"پریشان ہو بیٹا! کیا بات ہے؟" اس نے اس کے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا۔

"ماں! اب میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ باقاعدہ ماروی کا رشتہ لینے جائیں مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ وہ اپنی اس مٹھائی (منگنی) کو گاؤں میں ظاہر کر دیں یا ابھی فی الحال چھپا لیں۔"

"ابھی یہ بات ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ تمہیں فدا حسین اور اختیار کا پتا نہیں، وہ مرنے مارنے پر تل جائیں گے کہ ہماری بہن کو بچپن سے زبان دی ہوئی

ہے۔ اب اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتا ہے بیٹا! میں رشتہ لینے ضرور چلوں گی مگر یہاں برادری میں اس بات کو چھپا کر رکھنا چاہتی ہوں۔ شاید اللہ کوئی سبب پیدا کردے۔ اگر یہاں حالات ناموافق رہے تو میں ریٹائرمنٹ لے کر تمہارے ساتھ حیدر آباد چل کر رہوں گی۔"

"اور اسکول۔۔۔؟"

"اب وہاں میری ضرورت نہیں' تعلیم کا سلسلہ چل رہا ہے اور میرے بعد سارا ہیڈ مسٹریس بن جائے گی' وہ اول کے مضبوط سائبان میں ہے۔ تمہارے چچازاد اس کا نام بھی زبان پر نہیں لائیں گے ویسے بھی سارا اور ثوبیہ کو ہم احتیاطاً" اس معاملے سے لاتعلق دکھائیں گے۔"

اس کی ماں نے بہت اچھی پلاننگ کی تھی' وہ مسکرا دیا۔ وہ بھی بیٹے کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر مسکرادی۔

"تمہیں زندگی کی یہ سب سے بڑی خوشی دینا میری زندگی کا مقصد ہے بیٹا! بہت سارے خوابوں کی تکمیل کے بعد اب اسی خواب کو تعبیر دینا ہے کہ ماروی کو تمہاری دلہن بنے دیکھوں۔"

اس نے وفور مسرت سے ماں کے ہاتھ چومے تھے۔ زیب النساء نے محبت کی چمک سرمد کی آنکھوں میں دیکھی تھی اور خوشبو اس کے وجود میں محسوس کی تھی۔ وہ تو خود محبت کے زائرین میں سے تھی۔ اپنا وہ اسی راہ پر چلنے والی' احمد علی کی محبت' خواب' مقصد۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس سے الگ نہیں ہوئے تھے۔ اس نے اپنے کیے ہوئے وچن کو ہر مشکل حالات میں پورا کیا تھا۔

زندگی اس کے لیے پھولوں کی سیج تب تک تھی جب تک احمد علی اس کی ہمراہی میں تھا۔ اس کے وچھوڑے کے بعد تو کانٹوں کا بستر تھی جس پر کروٹیں بدلنے سے ہی جسم زخموں سے چور ہوتا تھا۔ بنی ہوئی عام راہ پر چلنا مشکل نہیں ہوتا مگر خود راہ بنانا پھر اس پر مسلسل چلتے رہنا بہت مشکل' کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ زندگی اس کے لیے جہد مسلسل تھی' اس دن سے جب اعلا تعلیم یافتہ احمد علی کی محبت اور اس کے شہر میں شادی کرنے کے خوف میں وہ پہلا قاعدہ لے کر اس کے پاس آبیٹھی تھی۔

اس نے احمد علی کی کوشش و تعاون سے تعلیم مکمل کی۔ ٹیچری کی پھر وہ جمہوریت پسند ہونے کے جرم میں بے روزگار کردیا گیا۔ اس پر کیس بنادیے گئے مگر وہ کبھی بھی ناامید اور مایوس نہیں ہوئی۔ احمد علی جیسا مضبوط روشنی بخشنے والا سائبان اس کے سر پر تھا۔ وہ اس سائبان تلے اپنے بچوں کی پرورش کرتی رہی۔

حالات کچھ موافق ہوئے تو اس نے نئی روشنی اسکول میں پڑھانا شروع کردیا۔ نئی حکومت نے وہ اسکول ختم کردیے مگر ان کے اساتذہ کی نوکریاں بحال رکھ کر ان کو پرائمری اسکولوں میں تعینات کردیا مگر احمد علی کی موت نے اسے توڑ دیا' مایوس کردیا۔ وہ اس غم کے پہاڑ کے نیچے آکر ریزہ ریزہ ہوگئی۔

پھر احمد علی کے خواب کو تعبیر دینے کے عزم نے اسے حوصلہ دیا اور عدت گزرنے کے بعد اس نے اسکول کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ آمریت کے بعد پہلی جمہوریت نے جاتے جاتے ان کے گاؤں کو لڑکیوں کے اسکول کا بھی تحفہ دے دیا۔

وہ دن رات ایک کرکے گاؤں کی بچیوں کو اسکول لانے کے جتن کرتی رہتی۔ ان کے والدین سے مل کر انہیں راضی کرتی اور صبح سویرے لڑکیوں کو گھروں سے نکال کر اسکول لے جاتی۔ کچھ عرصے بعد سارا بھی ٹیچر بن گئی تو اسے اور بھی آسانی ہوگئی۔

ان سارے کاموں میں جس نے اس کے ساتھ مل کر جی جان سے کوشش کی' وہ ماسٹر نیاز حسین کا پوتا اول حسین تھا۔ اول بہت اچھا اور نیک طبیعت انسان تھا۔ احمد علی کا ذکر اکثر اس کے گھر میں ہوتا تھا کہ وہ کیسے محنت سے آگے بڑھا۔ اس کی مثالیں دی جاتیں تھیں' اور وہ دل ہی دل میں احمد علی سے متاثر ہوگیا اور اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب احمد علی اس کا آئیڈیل بن گیا۔ احمد علی کے گاؤں آنے کا سن کر وہ اپنے لڑکپن کے دور سے ہی بھاگا بھاگا آتا تھا اس سے ملنے۔

جب اسکول بنا تو وہ اس گاؤں میں ہیڈ ماسٹر بن کے آیا۔ احمد علی کی وفات پر وہ ہر رسم میں شریک رہا پھر سرمد کو پڑھانا اس نے اپنے ذمے لے لیا۔ مڈل کے بعد اسکول پھر کالج میں داخلہ دلوا کر آگے پڑھانے میں بھی مدد کرتا رہا۔ جب اس نے سارا کا رشتہ مانگا تو زیب النساء کو اس سے بہتر کوئی لڑکا نظر ہی نہ آیا۔ اس کے [illegible] احسان کے بیٹے فدا حسین اور افتخار دونوں بچپن سے وڈیرے کے غلام تھے۔ اس نے بڑی دلیری سے دونوں کو ٹھکرا دیا اور سارا کا نکاح اول حسین سے کردیا۔ گھر میں بہت بڑا جھگڑا کھڑا ہوگیا۔

مگر اس کے سسر نے اس کا ساتھ دیا مگر ساتھ یہ تاکید بھی کی کہ سرمد کی شادی مہو سے کرنا۔

وہ مصلحتاً خاموش ہوگئی۔ دو سال بعد ثوبیہ کی شادی بھی اس نے اپنی مرضی سے کردی۔ وہ بہت کامیاب تھی اپنے مقصد اور زندگی میں۔

انٹر کے بعد سرمد کی حیدر آباد میں ایک نیوز پیپر میں ٹرینی کی جاب لگ گئی۔ وہ جاب کے ساتھ ساتھ سندھ یونیورسٹی میں پڑھتا رہا۔ ایم اے صحافت کے بعد وہ رپورٹر پھر سینئر رپورٹر بن گیا۔

حیدر آباد میں ہی اس کی ماروی سے محبت پروان چڑھی تھی' جب اس نے زیب النساء کو ماروی کے بارے میں بتایا تو اسے بے تحاشا مسرت نے آگھیرا مگر وہ مریم کو دیکھ کر غلطی کر بیٹھی۔ مرتضیٰ نے ہمیشہ مریم کے بارے میں یہی کہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ یہ تو نہ جانے کیسے اتنی مدت بعد اس نے ضمیر کی خلش سے تنگ آکر سچ بول دیا تھا۔

آج سرمد کی بجھتی آنکھوں کو پھر سے روشن ہوتے [illegible] سوچا تھا کہ وہ کیسے اس بیٹے کو دکھ اور [illegible] دینے جارہی تھی' جس بیٹے پر اس نے کبھی تنکا [illegible] بھی برداشت نہیں کیا تھا مگر فی الحال وہ اس بات کو چھپانا چاہتی تھی۔

سرمد چاہتا تھا کہ وہ علی الاعلان ماروی کو اپنی حیات بنائے' اس لیے پریشان تھا اور وہ اپنے وقت کی منتظر تھی۔

مہرالنساء جس کو اس نے بچپن سے مہو کے نام سے پکارا تھا۔ مہو گاؤں کی ان چند لڑکیوں میں سے تھی جن کو پڑھنے کی اجازت نہ ملی۔ زیب النساء چند بار خود چل کر دیور اور اس کے بیٹوں کے پاس آئی مگر ان کا جواب یہی تھا کہ جو لڑکیاں پڑھتی ہیں وہ لڑکوں کو خط وغیرہ لکھ کر بھاگ جاتی ہیں۔ اس نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کے دلائل ان کی ضد و جہالت سے ہار گئے۔ مجبوراً اس کو ہار ماننی پڑی۔

سرمد پہلے بھی ددھیال والوں سے زیادہ قریب نہیں تھا۔ مہو سے سرسری ہی بات ہوتی تھی۔ وہ خود بھی اکھڑی اکھڑی رہتی تھی۔ انٹر کے بعد تو وہ مستقل حیدر آباد میں رہنے لگا تھا۔ جب بھی گاؤں میں آتا تو وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتی۔ وہ اگر حال دریافت کرتا تو وہ "ٹھیک ہوں" کہہ کر اس کا دوسرا سوال سننے کے لیے رکتی نہیں تھی۔

اسے کئی دفعہ محسوس ہوا کہ وہ اس میں دلچسپی نہیں لیتی بلکہ اکثر و بیشتر اسے لگتا کہ وہ بے زاری کا مظاہرہ کررہی ہے۔ "مجھے اس سے کون سا لگاؤ ہے۔" وہ یہ سوچ کر سر جھٹک دیا کرتا۔

مگر پھر حیدر آباد میں پتا نہیں کیسے محبت نے اس کو آغوش میں لے لیا کہ اس کو پتا ہی نہ چلا۔

آہستہ آہستہ ماروی کی محبت ایک میٹھی کسک بن کر اس کے من میں چٹکیاں لینے لگی۔ وہ بھول بھال گیا کہ پیچھے اس کی منگیتر مہو بھی ہے۔ ماں کو جب ماروی کے رشتے کے لیے بھیجا تھا' تب بھی اسے خیال تھا کہ ان لوگوں کو پتا چل گیا تو ہنگامہ کریں گے۔ اب دوبارہ ماں رشتے کے لیے جارہی تھی تو اسے یہی پریشانی تھی۔

لائٹ چلی گئی تھی۔ اندر کمرے میں حبس محسوس کرکے وہ باہر نکل آیا۔

جاتی گرمیوں' آتی سردیوں کے موسم میں لوگ اب صحن سے بستر اٹھا کر اندر کمروں میں سونے لگے تھے۔ باہر آکر وہ ٹہلنے لگا۔ چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ چہرے پر داغ لیے کچھ شرمندہ

شرمندہ سے چاند کو اس نے سر اٹھا کر دلچسپی سے دیکھا۔

چاند جس کو شاہ سائیں نے طعنہ دیا تھا کہ

چند تہنجی ذلت' پاڑیاں نہ پریں سیں !

توں اچھو تہنجھ رات' مہنجو تجن سدائیں سوجھرو

(چاند تم چاہے کتنے ہی حسین ہو مگر میرے محبوب جیسے نہیں بن سکتے۔ اس کا اور تمہارا کوئی مقابلہ نہیں کہ تم صرف رات کو چمکتے روشن لگتے ہو مگر میرا محبوب تو ہمیشہ روشن رہتا ہے۔)

اور ابن انشاء کا چاند بھلا کیسا ہوگا' جس کے لیے انہوں نے چاند سے کہا تھا۔

ــ اس کو دیکھ کر عید کریں گے اپنا اور اسلام ہے چاند

محبوب کے چہرے اور چاند کا بھی کیا ہی دلفریب تعلق ہے۔ کبھی چاند میں محبوب کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے تو کبھی محبوب کا چہرہ چاند ایسا لگتا ہے' وہ مسکرایا۔

اس وقت میرا چاند بھی جام شورو کی فضاؤں میں سانس لے رہا ہوگا۔ لے رہا نہیں' لے رہی ہوگی۔ وہ خود ہی سوچ کی تصحیح کرکے متبسم ہوا۔ اس نے چاند کو دیکھتے آنکھیں موند لیں اور منہ نیچے کرکے بغور دل کی دھڑکنیں سنیں' جو اسی کا نام لے رہی تھیں۔ چند منٹ بعد آنکھیں کھولیں تو اسے سایہ سا نظر آیا۔ وہ آہستگی سے برآمدے کے پلر کی اوٹ میں ہوگیا۔

وہ یقیناً مہو ہی تھی جو دروازہ کھول کے باہر نکلی تھی۔ وہ حیران ہوا' یہ اس وقت کہاں جارہی ہے۔ وہ دروازے کی اوٹ میں آکھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ آئی۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے دروازہ بند کردیا۔ وہ بری طرح خوف زدہ ہوگئی پھر سامنے چاند کی روشنی میں کھڑے سرمد کو دیکھ کر اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

"دلدار سے ملنے گئی تھیں؟"

اس نے تردید نہیں کی' خاموش کھڑی رہی۔

"اگر کسی روز تمہارے بھائیوں کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔" سرمد نے غصہ دبا کر جھنجھلائے لہجے میں کہا۔

"یہ نوبت نہیں آئے گی۔" وہ کہہ کے رکی نہیں' تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

وہ اس کی دیدہ دلیری پر حیرت زدہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

کتنا عجیب اتفاق تھا کہ اس کو پہلے بھی دلدار سے ملتے اس نے پکڑا تھا۔ اس کے بھائیوں کو ابھی تک پتا نہیں چلا تھا کہ اس کی بہن کس راہ پہ چل نکلی ہے۔

پہلی بار جب اس نے اس کو باہر جاتے دیکھا تو اسے حیرت ہوئی کہ یہ رات کے دو بجے کہاں جارہی ہے۔ وہ اس کے پیچھے آیا۔ اسے آتے دیکھ کر وہ جو کوئی بھی تھا' گنے کے کھیت میں چھپ گیا۔

"تم رات کو کیا کرنے آئی ہو یہاں؟" اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" کہہ کر وہ بھاگ کر اندر گئی تھی۔

اس آدمی کو گنے کے کھیت میں ڈھونڈنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ سو اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا مگر اب وہ جب بھی گاؤں آتا مہو کی طرف سے چوکس ہی رہتا۔

آفس سے اس کے ایڈیٹر نے اسے فیچر لکھ کر مع فیکس کرنے کو کہا' وہ جھنجلا گیا۔

"سر! میں تین ماہ کے بعد گاؤں آیا ہوں۔ یہ آپ کسی اور سے لکھوالیں۔"

"ہو سانگی یار! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تمہارا تو قبائلی جھگڑوں پر رپورٹنگ کا وسیع تجربہ ہے۔ جتنا اچھا تم لکھ سکتے ہو کوئی اور نہیں۔ شاباش آج لکھ کے کل فیکس کردو۔ ہری اپ۔"

ایڈیٹر صاحب حکم سنا کے فون رکھ چکے تھے' اسے غصہ تو بہت آیا مگر اب چارہ کوئی نہیں تھا۔ ایڈیٹر صاحب کا حکم ٹالا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

وہ سندھ کے اندر قبائلی جھگڑوں پر فیچر لکھنے لگا کہ کیسے سردار' وڈیرے' نواب اپنے قبیلوں کو یرغمال بنائے رکھتے ہیں اور ان کی زندگی و موت کے فیصلے سناتے ہیں۔ اگر کوئی ان کے احکامات کی خلاف ورزی

کرتا ہے' اس کی ملکیت کو اپنے پاس رکھ کر ان کو علاقہ بدر کردیتے۔ پولیس میں جھوٹے مقدمات' زمینوں کا بند کرنا' ان کے مال مویشی چرانا اور فصلوں کو آگ لگانا۔ ان جرائم کو اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں' کوئی الیکشن میں ان کے خلاف ووٹ دیتا تو ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتا۔

پاکستان کے سارے جاگیردار کسی کو بولنے اور اپنے حق میں سر اٹھانے کا حق دینے کے سخت مخالف تھے۔ وہ ہر طریقے سے اپنی سرداری کو بچانے اور مضبوط کرنے کے حق میں تھے۔ آپس میں رشتہ داریاں کرکے اپنے قبیلوں کو مضبوط بنانے کے کامیاب پلان بناتے اور پیتے وہ جن کا جینے کا حق بھی وہ اپنے ہاتھ رکھے رہتے۔

ایک فرد کی لڑائی ان وڈیروں کی آشیرباد سے پورے قبیلے تک پھیل جاتی پھر وہ نہیں دیکھتے کہ کون مجرم ہے۔ کون بے گناہ' دوسرے قبیلے کے کسی بھی فرد سے انتقام لے لیتے۔ یوں دونوں قبیلوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی اور دوسرے قبیلے کا کوئی بھی فرد ہاتھ لگتا تو اسے چھوڑتے نہیں۔ ایک فرد کے جرم و جھگڑے کی سزا پورے قبیلے کو دینے کے چکر' اس قبیلے کے سردار یا وڈیرے کے حکم پر چلائے جاتے۔ وہ اپنے قبیلے کا جرگہ بلا کر حکم صادر کرتے اور دوسرے قبیلے نے مجرم نہیں دیا وہ بھاگ گیا تو پورے قبیلے سے انتقام کی دھمکیاں دے کر پریشرائز کیا جاتا۔ نتیجتاً اسکول بند ہوجاتے۔ خوف کے عالم میں لوگ زندگی گزارتے' مورچہ بند ہوکر بیٹھ جاتے۔ چونکہ دوسرا قبیلہ پورے قبیلے سے انتقام لینے کی دھمکیاں دیتا۔ سو جوان جھگڑوں کا حصہ نہ بھی بننا چاہتے' وہ غریب بھی مجبوراً "یا جبراً" حصہ بنتے۔ پوری قوم' برادری' قبیلہ ایک سردار کے ہاتھ یرغمال ہوتی اور وہ ان کی ڈوریاں موقع کی مناسبت سے کھینچتے رہتے۔

یہی حال الیکشن کا تھا کہ اپنے قبیلے اور برادری کی پر جیت کے آتے' اسی لیے ان کو اپنی پارٹیوں اور منشور کی پروا بھی نہیں ہوتی مگر اس کی ذمہ دار پاکستان کی بڑی سیاسی پارٹیاں بھی ہیں۔ چاہے وہ اسٹیبلشمنٹ کے زیر سایہ پلی ہوں یا اس کی مخالف ہوں۔ یہ سردار' وڈیرے' جاگیردار ہر جگہ مساوی ہیں۔

اسے ایسے جاگیرداروں سے نفرت اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی' اس کو کئی بار دھمکیاں بھی مل چکی تھیں مگر وہ ڈرنے' بکنے اور جھکنے والوں میں سے نہیں تھا۔ جاگیردارانہ سسٹم کے خلاف بڑے دھڑلے سے لکھتا۔

اس نے کام ختم کیا تو کافی رات گزر چکی تھی' چارپائی پر آکر لیٹا تو [illegible] کی یاد دل کے اندر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔ اس کے چاروں اطراف اجالا پھیل گیا۔ وہ تصور میں مجسم تصویر بنی کھڑی تھی۔ قدموں کی آہٹ پر اس کے تصور کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ مہو اپنی چارپائی سے اتر کر باہر جارہی تھی۔ اس نے چاہا اٹھ کر اس کے پیچھے جائے۔ یک دم اس کی محبت اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

وہ چور سا بن گیا۔ یہ انسان کی فطرت ہے' جب تک اس کو اپنی ذات کے حوالے سے حقائق کا ادراک نہیں ہوتا' تب تک وہ صرف اپنی سوچ دوسروں پر مسلط کرتا ہے۔ سرمد یہ چوٹ کھائے ہوئے تھا' اس لیے وہ مہو کو روکنے کی ہمت نہ کرسکا۔ البتہ ٹارچ جلا کر اس نے مہو کو یہ احساس ضرور دلایا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ اس نے مڑ کر ایک لمحے کو اسے دیکھا پھر باہر نکل گئی۔

اسے مہو کے نڈر پن اور دلیری پر شدید حیرت ہوئی۔ شاید محبت انسان کو کچھ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑتی۔

پانچ منٹ بعد وہ واپس آگئی تھی' اس نے پھر ٹارچ روشن کرکے اسے اپنے جاگنے کا احساس دلایا تھا۔ وہ صحافی تھا' بات کی تہہ تک پہنچنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ دلدار سے ہی ملنے جاتی تھی۔ دلدار' مہو کے بھائی اختیار کا جگری یار تھا۔ وہ دونوں مل کے وڈیرے کی زمین پر کاشت کررہے تھے۔ دلدار کے بھائی کی تیس ایکڑ زمین اس کا بڑا بھائی سنبھالتا تھا۔ وہ

یہاں زمین آباد کر رہا تھا۔ سارا دن بے دھڑک ان کے گھر آنا جانا، کھانا پینا، بیٹھا رہتا۔ البتہ رات کو وہ باہر سوتا۔

"صبح میں اس سے ضرور بات کروں گا۔" یہ سوچ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

صبح خدا حسین اور اختیار جب گھر سے نکل گئے تو وہ اس کے سامنے آگیا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

وہ وتھان (باڑے) میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ جب اس نے بھینس کے آگے چارہ ڈالنے کے بہانے اس سے بات کی۔

اس نے سر اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا پھر سے لاپروائی سے جھاڑو لگانے لگی۔ "یہ اپنا راستہ لو" والی بات تھی۔

وہ اس کی لاپروائی پر متبسم ہوا، صحافی تھا۔ مقابل سے اپنے سوال کا جواب لینا خوب جانتا تھا۔

"اگر میں اختیار کو بتادوں تم کس سے ملنے جاتی ہو؟" اس نے بھینس کی پیٹھ تھپک کر کہا۔

"تم نہیں بتاؤ گے۔ تم ہی تو لکھتے ہو ناکہ لڑکیوں کو ان کی مرضی کی شادی کی اجازت دی جائے تو کارو کاری کے بہت سارے واقعات سرے سے ختم ہو جائیں گے۔ تمہیں تو نفرت ہے ناوڈیروں اور ان کے چیلوں سے پھر کیوں وڈیروں کے نظام کا ساتھ دو گے؟" وہ جارحانہ انداز میں اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"میں صرف تمہاری بھلائی چاہتا ہوں، تمہارے بھائیوں کو پتا چل گیا تو پھر تم اپنے انجام سے بے خبر نہیں ہو۔" وہ لاجواب ہو کر بولا تھا۔

"محبت انجام کا سوچنے کب دیتی ہے ادا سرمد...!" اس کا لہجہ دھیما ہوا۔

وہ اس کے ادا کہنے پر بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"مگر تم احتیاط کرو تو اچھی بات ہے۔ میں نہیں چاہتا تم بے موت ماری جاؤ۔" سرمد نے رسانیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میری تقدیر تم نے نہیں لکھی جس نے لکھی اس نے لکھ دی۔ اب تمہارے یا میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

وہ جھاڑو پھینک کر اٹھی۔ "میں موت کے خوف سے زندگی سے منہ نہیں موڑ سکتی۔"

اس نے سرمد کے سامنے آکر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اس کا جواب سننے کے لیے رکی نہیں تھی۔

اس نے سوچا وہ اختیار سے بات کر کے ولدار کا گھر میں آنا جانا بند کروا دے گا اور رات کو گیٹ پر تالا لگوا دے۔ یہ کہہ کر کہ علاقے میں چوری کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کا اس ایک حل کے علاوہ فی الحال کوئی اور حل اسے نہیں سوجھا تھا۔

"یہ بے وقوف لڑکی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔" اس نے پریشانی اور تاسف سے سوچا۔

☆ ☆ ☆

سجاد علی بحال ہو کر اس سیٹ پر واپس آگیا تھا، وہ اس کے ماتحت کام کرے، یہ ناممکن تھا، وہ حد درجہ پریشان ہوئی۔ اس نے پہلے ہی این جی اوز کی ماہانہ میٹنگز وغیرہ میں جانا چھوڑ رکھا تھا۔ آفس ورک میں خود کو زیادہ مصروف رکھتی۔ جن تنظیموں نے قرضے وغیرہ منظور کروانے ہوتے، اس تنظیم کی صدر و منیجر اس سے آفس میں ملنے آجاتیں۔

وہ لوگوں کی سوالیہ، طنزیہ، استہزائیہ نظروں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی، اس لیے ان سے ملنے سے کترانے لگی پھر مردوں کے معاشرے میں ان کے بنائے ہوئے نظام میں عورت بے گناہ ہوتے ہوئے بھی سماج کے اندر معتوب ٹھہرتی ہے، سو وہ بھی معتوب تھی۔

اس نے فوراً سائیں کو فون کر کے سجاد علی کی بحالی کا بتایا۔ اسے عجیب سی تضحیک کا احساس ہو رہا تھا۔ سجاد علی کا بحال ہو کر واپس آنا اس کی جیت تھی۔ وہ حق پر ہوتے ہوئے بھی ہار گئی تھی۔ وہ بہت مشکل سے چکراتے سر کے ساتھ گھر پہنچی تھی۔

بار بار اس کے تصور میں اخبارات میں چھپی من گھڑت خبریں اور سجاد علی کے جھوٹے الزامات آرہے تھے۔ اذیت میں گزارے وہ شب و روز یاد آرہے تھے۔ سرمد اس کی مدد کو نہ اٹھتا تو شاید وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتی۔

شام کو وہ اس کے سامنے موجود تھا۔

"میں اب اس ادارے میں کام نہیں کر سکتی۔" اس نے سرمد کو دیکھتے ہی بے چارگی سے کہا۔

اس نے ماروی کے ستے ہوئے چہرے، سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھا۔ وہ اپنے تئیں اسے راضی کرنے آیا تھا کہ وہ اس ملازمت سے استعفیٰ نہ دے لیکن ماروی کی پریشانی اور ذہنی تناؤ کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

"میں اس کے ساتھ کام کر ہی نہیں سکتی۔ کرنا چاہوں بھی تو مجھ سے کام نہیں ہوگا سرمد!" وہ بے بسی سے بولی۔

سرمد کو شدید غصہ آرہا تھا۔ ہیڈ آفس نے سجاد علی کو بحال کر کے اپنے ادارے کی ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے کون اپنی بیٹیوں کو یہ ادارہ جوائن کرنے دے گا جوان کی بہبود کے لیے بنایا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے اگر کام ہی کرنا ہے تو اور بھی ادارے ہیں، جہاں تم کام کر سکتی ہو۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی ایسے ہی ادارے میں تمہیں جاب مل جائے جہاں سجاد علی جیسے گندے گدھ نہ ہوں۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"تھینک یو سرمد! میرے سر سے بوجھ اتر گیا۔ تم نے پہلے بھی مجھے ریزائن کرنے نہیں دیا تھا، مجھے یہی پریشانی تھی کہ تم اب بھی یہی کہو گے۔" وہ مسکرائی۔

"تمہیں اتنی پریشانی کیوں تھی؟"

"اس لیے کہ میں تمہاری بات ٹالنا نہیں چاہتی تھی اور وہاں کام بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں عجیب مخمصے اور مشکل میں گھری ہوئی تھی۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

سرمد سائیں اسے تکتا رہ گیا۔

"کیا یہ ماروی اس ماروی سے الگ ہے۔ جس کو شاہ سائیں نے گایا ہے۔ اس کو وقت کے بادشاہ نے قید کیا اور اسے بھی وقت کے عمر نے اغوا کیا اور ماروی کا حسن دونوں زمانوں میں اس کے لیے وبال بن جاتا ہے۔"

شاہ سائیں نے ماروی کے لیے کہا تھا۔

"اگر میں اس کے زمانے کو پاتا تو عمر کے پاس جا کے عرض کرتا۔ اس کے بدلے اپنا انگ (جسم) پیش کرتا۔ اس سوہنی ماروی کو زنجیروں سے آزاد کرا کے اس کے ماروئوں (عزیزوں) کے پاس پیار سے پہنچا کے آتا۔"

وہ بھی تو اس ماروی کو رستے ہوئے بازو سے پکڑ کر لے آیا تھا۔ اس سے صدیوں کا فاصلہ کہیں گم ہو گیا اور اسے لگا وہی ماروی عمر کے محلات سے اٹھ کر اس کے سامنے آبیٹھی ہے جو اپنے جھونپڑوں کو نہ بھول پائی جس نے اپنے ساتھیوں کے لیے عمر کے محلات کو ٹھکرا دیا۔

جس نے انواع و اقسام کے کھانوں پر ملیر کی مٹی کی جنگلی سبزیوں اور پھلوں، ریشم پر کھدر، محل پر کچے جھونپڑے، میووں پر جنگلی گھاس، نرم بستروں پر تھر کی ریت کو فوقیت و ترجیح دی، جو اپنی سرتیوں (سہیلیوں) کو یاد کر کے روتی جو کہ زمین میں کھنڈے چن رہی ہوں گی، بکریاں چرا رہی ہوں گی، آزادی سے تھر کی ریت پر گھوم رہی ہوں گی۔ وہ عمر کے محل میں بیٹھی قید سے آزادی کی دعائیں مانگتی اور اپنے ماروؤں سے شکوے کرتی، جنہوں نے اس کی پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ وہ ان طعنوں کو سہنے کے لیے بھی تیار تھی جو بے قصور ہوتے بھی اس کے عزیز اس کو دیتے مگر وہ واپس پلٹنا چاہتی تھی۔ اپنے عزیزوں اور اپنی محبت کھیت کے پاس جن کی نظروں میں اب وہ پہلے والی ماروی نہیں رہی تھی۔

اس نے صدیوں کا سفر پل میں طے کر لیا تھا۔ شاہ لطیف نے کہا تھا۔

"میں نے محلوں میں ماروی کو دیکھا، وہ اداس و ملول تھی۔ اس کے بال خشک تھے، وہ لوہے کی زنجیروں میں قید تھی۔ وہ تیل خوشبوئیں لگا کر بن سنور کے

نازو نخرے نہیں دکھاتی۔"

اس نے ماروی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شاہ سائیں کا بیت پڑھا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ جوابی بیت اس کے لبوں پر مچلنے لگا۔

تن رہین وٹاں لڈ جن جی نا ہے مہاڑ لیمرڑے
سانگین سے سید چئے روڈ اچی لڑ
تہ حالے نجے سندی ھلڑ کوک نہ سنیں کڈھیں

(ان بیکار وحشی لوگوں کو چھوڑ کر ان سے دور ہو کر ہجرت کرو جن کا رخ خلیر (صحیح راستے) پر نہیں ہے۔ سانگیوں کے قریب آکر جھونپڑے بنا کر رہو تو ظلم و جبر کی فریاد کبھی نہیں سنو گے۔) ماروی کا بیت بے ساختہ جواب سن کر سرمد مسکرا دیا۔

وہ ظلم کے اندھیروں کو ختم کرنا چاہتا تھا اور روشنی پھیلانا چاہتا تھا۔ وہ روشنی جو اس ماروی کی دھرتی کے غریب مسکین سادہ لوگوں کو بیدار کر دے تاکہ وہ سینہ سپر ہو کے ظالموں کے خلاف میدانِ عمل میں آجائیں۔

اکتوبر کی گرم دوپہر کے بعد ٹھنڈی شام اتر رہی تھی۔ پرندے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

ایسے ہی کسی غول کو دیکھ کر شاہ سائیں نے اشرف المخلوقات کو دعوت فکر دی تھی۔

"اے انسان! ان پرندوں سے سبق حاصل کر جو اپنے اپنے حصے کا رزق چن کر کتنی محبت سے مل کر اپنے گھونسلوں کی طرف اڑتے ہیں جو دوسرے سے اس کا حصہ نہیں چھینتے۔ ان کے اندر کی مٹھاس ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتی۔

وہ بھی اسی پریت اور مٹھاس کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔

محبت کی فصل اگر من کے اندر اگنے لگے تو پریت کا پھل خود بخود میٹھا اور ذائقہ دار ہو جاتا ہے۔

انسان کی ترشی و تلخی گھاس پھوس کی طرح سوکھ جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

سراپا محبت سرمد سائنگی جس کو موہو کے نذر بن نے پریشان کر دیا تھا۔ وہ موت کی طرف بڑھ رہی تھی اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا بہت سوچنے کے بعد ایک ہی حل اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے تاکہ دلدار کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔ وہ ماں کو ماروی کے گھر لے جانا چاہ رہا تھا' اس کا ارادہ تھا نکاح کرنے کے بعد آکر وہ پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹے گا' تاکہ سب کو اطلاع مل جائے مگر تب تک موہو کو محتاط رہنا چاہیے۔ وہ دلدار سے بھی بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ اختیار کو کہے کہ دلدار کا گھر میں آنا جانا بند کرا دے۔

وہ صبح جلدی اٹھ کر سردار کی اوطاق پر چلے جاتے تھے' سو وہ ناشتہ کیے بغیر ان کے پاس آگیا۔ دونوں چبوتروں کے بیچ تین فٹ کی گرل ہی تو لگی ہوئی تھی۔

"آجاؤ آجاؤ' آج کیسے راستہ بھول پڑے سرمد؟" فدا حسین ہاتھ جوڑ کر اس سے ملتے ہوئے بولا۔

"بس اوا! کچھ ضروری بات کرنی تھی آپ سے۔"

"ہاں ہاں' آجاؤ آجاؤ۔ بات بھی کرلیں گے' پہلے ناشتہ تو کرلیں۔" فدا حسین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں ہی اپنے سامنے پڑی کرسی پر اس کو بٹھایا۔

"او ہو! آج تو انسانی حقوق کا علم بردار ہمارے گھر آیا ہے۔"

"آپ کو اعتراض کس بات پر ہے۔ علمبردار ہونے پر یا گھر آنے پر۔" اختیار کے چبھتے لہجے کا اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ارے نہیں' مجھے تو دونوں باتوں پر اعتراض نہیں۔" اختیار کھسیانا ہو کر اس سے گلے ملنے لگا۔

اختیار سے مل کر کرسی پر بیٹھتے ہی اس کی نظر سامنے روٹیاں پکاتی موہو پر پڑی۔

اس کی نگاہوں میں التجا تھی اور خوف کی پرچھائیاں۔

"پاگل سمجھ رہی ہے میں اس کی شکایت لگانے آیا ہوں۔" اس نے نظریں موہو پر سے ہٹالیں' تب ہی

ایک لڑکی روٹی کی چنگیر لے کر ان کے سامنے روٹیاں رکھنے لگی۔ اس نے اپنے سامنے تازہ روٹی رکھنے والی اجنبی لڑکی کو حیرت سے دیکھا۔

"یہ میری بیوی ہے۔" اس کی سوالیہ نگاہوں کا اختیار نے جواب دیا۔

"اچھا۔ کیا تیسری۔"

"ہاں' تیسری۔ تمہیں اعتراض؟" اختیار چڑ گیا۔

"نہیں نہیں' مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"آپ کی مرضی ایک رکھیں یا دس اوا! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا تھا۔"

اختیار کا موڈ آف دیکھ کر اس نے فدا حسین سے بات کرنا بہتر سمجھا۔

"ہاں ہاں کہو۔" فدا حسین نوالہ چباتے ہوئے بولا۔ "مگر ناشتہ کیوں نہیں کر رہے ہو؟" فدا حسین نے آملیٹ کی پلیٹ اور لسی کا جگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا کر روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اوا! میں آپ کو بتانے آیا ہوں کہ مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں اور علاقے میں بدامنی بھی بڑھ رہی ہے۔ سو میں چاہتا ہوں کہ آپ رات کو گیٹ پر تالا لگوا دیں اور پہرہ بھی بٹھا دیں۔"

"دھمکیاں کون دے رہا ہے تمہیں؟" فدا حسین پرسوچ انداز میں بولا۔

"میرے تو بہت سارے دشمن ہیں' کوئی ایک نہیں۔ کس کا نام لوں۔ مجھے میسجز کے ذریعے دھمکایا جا رہا ہے کہ سچ لکھنا چھوڑ دو۔ سو وہ میں چھوڑ نہیں سکتا۔"

"ہاں تو تم خود کو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہو۔ بڑے بڑوں کے خلاف لکھو گے تو وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔ ارے! تم تو ان کی ایک گولی کا رزق ہو۔" اختیار کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"اختیار! منہ سنبھال کے بات کرو۔" فدا حسین کو اس کی بات ناگوار گزری تھی۔

اس نے فدا حسین کو بولتے دیکھ کر اختیار کو جواب دینے کا ارادہ ملتوی کیا۔

"اور دوسری بات یہ کہ دلدار غیر ہے' مجھے اس کا یوں گھر میں آنا جانا پسند نہیں۔ اس سے کوئی رشتہ داری ہوتی تو اور بات تھی۔" اس نے بڑی سمجھ داری سے اصل مدعا بیان کیا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے دلدار کے آنے سے۔ خود کو نہیں دیکھتے' جب دو بہنیں غیروں میں بیاہیں' تب نہیں سوچا کہ یہ غیر گھروں میں آئیں گے۔ اب بڑے آئے ہیں غیرت مند کہ دلدار غیر ہے۔" اختیار غصے سے بے قابو ہو گیا۔

اس نے تحمل سے بات سنی پھر ہنس کے بولا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا' اگر تم لوگ بھی دلدار سے رشتہ داری جوڑ لو۔"

"بے غیرت! ہمارے گھر میں بیٹھ کر ہمیں گالی دیتا ہے۔ ہاں حیثیت کیا ہے تیری۔ کل کا لال منہ والا چھورا۔" اختیار کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سرمد کو دھن کے رکھ دے۔

"اوا! آپ دیکھ رہے ہیں اختیار کی زبان۔ میں اس سے نہیں' آپ سے بات کرنے آیا تھا۔" سرمد نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ارے چل چل دو ٹکے کا صحافی ...!"

"اختیار! چپ کر جو منہ میں آیا بکے چلے جاتا ہے۔" فدا حسین نے اسے گھرکا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے' کسی اجنبی و غیر کو گھر کے فرد کی سی اہمیت دینا ٹھیک نہیں۔ وہ سارے گھر میں بغیر کسی روک ٹوک کے دندناتا پھرتا ہے۔ یہ گھر ہمارا بھی ہے' ہم اعتراض کا حق رکھتے ہیں۔"

سرمد نے کہتے ہوئے ایک نظر موہو پر ڈالی جو ان کے جھگڑے سے دور راز کھلنے کے خوف سے زرد پڑ رہی تھی' وہ اٹھ کر باہر آگیا۔

فدا حسین نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس

نے غصے میں اس کی بات نہیں سنی۔ اب تو مہو سے بات کرنا' سمجھانا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں بہت جلد آپ کو حیدر آباد بلواؤں گا۔" گاؤں سے واپسی پر وہاں سے کہہ کر آیا تھا۔

اس نے حیدر آباد پہنچ کر ماروی کو جتایا اور ماروی کو اس اہم موقع پر گل کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ وہ چند ماہ سے گم تھی۔ اتنا عرصہ تو وہ مسلسل کہیں بھی نہیں رہتی تھی۔ تعلیمی سلسلہ منقطع ہونے کے بعد وہ کہیں بھی ٹک کر نہیں رہتی تھی۔ اس نے چند بار سرمد سے بھی پوچھا تھا۔

"وہ تو ہے ہی ایسی لاابالی۔ قلندر کی فقیر کبھی کہاں' کبھی کہاں۔" وہ ہنس کر ٹال جاتا۔

"سرمد! گل جہاں بھی ہو' اسے بلاؤ۔" وہ فون پر جھنجلائی۔

"آخری اطلاعات تک وہ دبئی میں تھے۔ میں پتا کرتا ہوں' کہاں ہے۔" اس نے سیل آف کر دیا۔ وہ اس وقت کنسٹرکشن کمپنی کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے تعلقہ قاسم آباد میں فلیٹ بک کروا لیا ہوا تھا۔ اب جلد از جلد مکمل کرانا چاہتا تھا۔ تعلقہ قاسم آباد' حیدر آباد کا تقریباً" نیا تعلقہ تھا جس کا وجود تب بنا جب دھرتی کے باسیوں کے پاؤں کے نیچے دھرتی کھسکنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ویرانہ جنگل قاسم آباد کے نام سے آباد ہو گیا اور پھر سندھ کے کونے کونے سے لوگ تعلیم' روزگار' کاروبار کے سلسلے میں رہائش پذیر ہوتے چلے گئے۔ کراچی' منی پاکستان تھا تو حیدر آباد کا تعلقہ قاسم آباد' منی سندھ بن گیا۔

سندھ کے چاروں کونوں کے ہر طبقے کے لوگوں نے اس کو اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ آئے دن نئی رہائشی اسکیمیں تیار ہوتی رہتیں۔ اس نے بھی اپنا اپارٹمنٹ اسی علاقے میں بک کرایا تھا۔

"ٹائلز' ماربل فلورنگ اور پینٹ رہتا ہے آپ کے اپارٹمنٹ میں۔ اگر آپ پے منٹ یکمشت کر دیں تو ان شاء اللہ ہم آپ کو ایک ماہ میں فلیٹ کمپلیٹ کر کے دے سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں پے منٹ آپ کو کل ہی پہنچا دوں گا۔" وہ کہہ کر آفس سے باہر نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

ماروی کے اصرار نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

"کیا مجھے اس کو بتا دینا چاہیے؟" لائٹ آف کر کے بستر پر جاتے ہوئے اس نے سوچا۔

"کاش سرمد! ماروی میری بہن ہوتی۔" گل نے ماروی کے گھر سے نکلتے ہوئے ہمیشہ کی طرح حسرت کا اظہار کیا تھا۔

"اور اگر وہ تمہاری بہن نکل آئے تو؟"

"تو میں خوشی سے پھولے نہ سماؤں گی۔ مٹھائی بانٹوں گی' ایک بہت بڑی پارٹی ارینج کروں گی' جس میں تمہیں جوکر بناؤں گی اور دنیا کو بتاؤں گی کہ بھئی دیکھو یہ گل اس دنیا میں اکیلی نہیں ہے۔ ماروی جیسی پیاری بہن رکھتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

وہ اس کے غیر سنجیدہ رویے پر چند لمحے تک اسے دیکھتا رہا۔

"گل! ماروی واقعی تمہاری بہن ہے۔"

"چھوڑو سرمد! کیوں انہونی کو ہونی قرار دے رہے ہو۔" اس نے آئس کریم کھاتے ہوئے ازلی لاپروائی سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے' ماروی نے بتایا تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو چھوڑ دیا تھا۔"

"ہاں' بالکل یاد ہے۔"

"تمہیں پتہ ہے وہ کون تھے؟"

"نہیں۔" اس نے سوالیہ انداز میں سرمد کو دیکھا۔

"انکل مرتضیٰ۔" سرمد سرسری انداز میں کہہ کر انہماک سے آئس کریم کھانے لگا۔

وہ آئس کریم بھول کر چند لمحے حیرت سے تکتی سرمد کو دیکھتی رہی پھر دفعتاً اٹھی اور شاپ سے باہر نکل گئی۔

سرمد خاموشی سے گاڑی کا لاک کھول کر اس کو جاتے دیکھتا رہا۔ کافی دنوں بعد اس نے ماروی کے کہنے پر فون کیا تو اس کا سیل آف تھا۔ وہ دبئی چلی گئی تھی اپنی ماں کے پاس۔

سرمد کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کو اپنے باپ کے بارے میں جان کر دھچکا لگا تھا۔ اس کا باپ اس کا آئیڈیل تھا۔ ہر بات میں وہ اپنے باپ کی مثالیں دیتی تھی۔ اس دن کے بعد گل اس سے نہیں ملی تھی۔

وہ سیدھا انکل مرتضیٰ کے پاس آیا تھا۔

"وہ مجھ سے ناراض ہے' کہتی ہے۔ ماروی آپ کو معاف کرے گی تو پھر میں واپس آؤں گی' ورنہ نہیں جبکہ ماروی تو میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ مجھے کیسے معاف کر سکتی ہے؟" مرتضیٰ نے پریشانی سے ہاتھ ملے۔

"انکل! کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ یہاں تو لوگ خون تک معاف کر دیتے ہیں۔"

"میں نے بھی تو کسی کے دل کا خون کیا ہے۔ گل کہتی ہے' میں نے ساری عمر ماروی کو زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے ترستے دیکھا ہے۔ اس کی خود دار طبیعت نے کبھی کسی کی یا میری مدد قبول نہیں کی۔ وہ اتنی غربت میں' کسمپرسی کی حالت میں رہی۔ وقت میری مٹھی میں نہیں ہے بیٹا! جس کو میں واپس لاسکوں۔ اب تم ہی بتاؤ' کیا ازالہ کروں؟" مرتضیٰ نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"میں رائیگاں مسافتوں کا مسافر ہوں بیٹا! آج سب کچھ ہوتے ہوئے میرے دامن میں کچھ بھی نہیں۔ میرا آنگن خالی ہے' میرا گھر سونا ہے۔ میں ساری عمر محبتوں کے لیے ترستا رہا ہوں کیونکہ میں نے محبت سے وفاداری نہیں کی تھی۔ اتنی دولت' امارت' کوٹھی' موٹر ہوتے بھی تہی دست ہوں کیونکہ میرے ارد گرد بسنے والے پیسے کی وجہ سے میرے ساتھ رہتے ہیں' کسی وجہ سے نہیں۔ ایک کو میں نے چھوڑ دیا' ایک مجھے چھوڑ گئی۔ دونوں بیٹیاں مجھ سے دور ہیں۔ میرا ایک بھی سچا رشتہ نہیں۔ کیا کروں اس دولت کا۔" بات کرتے کرتے ان کا گلا رندھ گیا۔

سرمد نے اٹھ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"انکل! میں کوشش ضرور کروں گا' کامیابی خدا کے ہاتھ ہے کہ ان کے دلوں میں معافی اور درگزر ڈال دے۔"

☆ ☆ ☆

"مہو گھر سے بھاگ گئی۔" یہ خبر اس کو حیدر آباد میں ملی تھی۔

"کہاں' کس کے ساتھ؟" اس نے بے ساختہ اپنے بڑے بہنوئی اول حسین سے پوچھا۔

"دلدار کے ساتھ۔"

"دلدار پر ہی شک کیوں؟" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے فون پر کہا۔

"اس لیے کہ دلدار بھی غائب ہے۔ اس کے بڑے بھائی نے اپنی آبائی زمین بیچ دی ہے اور بیوی بچوں سمیت وہ بھی غائب ہے۔ تمہارے چچازاد خونخوار درندوں کی طرح دھاڑتے پھر رہے ہیں۔ دعا کرو' مہو ان کے ہاتھ نہ لگے۔" اول کا لہجہ رنجیدہ ہو گیا۔

"ہاں اول! خدا کرے مہو ان کے ہاتھ نہ لگے اور دلدار ثابت قدم رہے۔" اس نے سیل فون آف کر دیا۔

بہت برا ہوا تھا جس بات سے وہ ڈر رہا تھا' وہ ہو کر رہی تھی۔ اسے بے طرح رنج نے آگھیرا۔ "کاش مہو! تم اتنی جلدی نہ کرتیں۔ کچھ تو وقت کا انتظار کرتیں۔ ہو سکتا ہے وقت تمہارے حق میں ہو جاتا۔"

یہ اس کی سوچ تھی' اختیار' مہو کا رشتہ دلدار کی ساتھ کبھی نہ کرتا کیونکہ دلدار غیر برادری کا تھا۔ اس کی ماں نے جب سارا کی شادی اول کے ساتھ کی تھی تو ان لوگوں نے بہت شور مچایا تھا مگر تب دادا زندہ تھا' اس نے ماں کا ساتھ دیا تھا۔

"اب کیا ہو گا؟" وہ بے چین ہو اٹھا۔ "وہ لوگ آخر کتنا چھپیں گے' بالآخر سردار اور اس کے پالتو کتے ان کو زمین کی تہہ سے بھی نکال باہر کریں گے۔ کاش مہو! تم

ذرا صبر سے کام لیتیں۔ میں خود تمہارا ساتھ دیتا۔"

اس کی ذہنی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ایک دردناک موت مہو کا مقدر نظر آ رہی تھی۔ اسے کوئی چیز بچا سکتی تھی تو وہ دلدار کی غیرت اور محبت تھی۔ اگر دلدار نے سردار کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور مہو کو سردار کے حوالے کر دیا تو اس کی زندگی کا فیصلہ پھر جرگہ کرتا اور جرگے کے اندھے قانون سے اسے مہو کی جان بخشی کی کوئی امید نہیں تھی۔ امید تو اسے دلدار سے بھی کم ہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں محبت کے میدان میں مرد ہی کیوں ہار مانے گھٹنے ٹیکتے نظر آتے ہیں۔ اسے ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوتی کہ آخر سوہنی ہی کیوں تیر کر آتی رہی۔ مہینوال کیوں نہیں؟ وہ مرد تھا۔ تیرنا اس کی شان تھی' وہ کیوں صرف بیٹھ کر انتظار ہی کرتا رہتا۔

آخر سسی نے ہی کیوں صحرا کی صعوبتیں کاٹیں' عشق کے پُرپیچ سفر پر محوِ سفر ہو کر وہ درندوں سے بھری ہوئی راہ گزر پر چلتی رہی۔

ہیر ہی کیوں بیمار ہوئی' اس روگ میں رانجھا کیوں نہیں؟

سیتا ہی کیوں اقتدار کے لیے بن باس کاٹنے والے کرشن کے چرنوں میں بیٹھ کر اس کی سیوا کرتی رہی پھر سیتا کا دامن شک سے تار تار کر دیا گیا۔

مردوں کے قبیلے میں فرہاد اور قیس نے ہی مردوں کی لاج رکھی ہے' ورنہ تو عشق کے ہر داستان کے پیچھے عورت کی وفا ہی مشروط رہی ہے۔

اور اب پتا نہیں دلدار عشق کے میدان کا شہسوار ہو گا یا بھگوڑا؟

☆ ☆ ☆

وہ اک طویل و بور پریس کانفرنس کور کر کے ماروی کے پاس آیا تھا۔ باہر صحن میں بیٹھی نانی کو سلام کر کے وہیں بیٹھ گیا۔ وہ اس کی آواز سن کے باہر نکل آئی۔

"تمہارے لیے خوش خبری ہے۔" اس نے مسکرا کر کاٹن کے پرنٹڈ کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس اس کے اجلے روپ کو دیکھا۔

"کون سی مہو والی؟" اس نے تھوڑا ناراضی سے کہا۔

"نہیں۔" وہ اس کے ناراض لہجے پر بے ساختہ ہنسا۔ "جاب کی۔ لیلیٰ حسین کو آرڈینیٹر لگا ہے اک عورتوں کی فلاحی تنظیم سجاگی (بیداری) میں۔ اسے اسسٹنٹ کو آرڈینیٹر کی ضرورت ہے۔ مجھ سے ذکر کیا تو میں نے تمہارا نام لیا۔ تمہیں این جی اوز کا وسیع تجربہ ہے۔ لوگوں کو کنونس کرنا تمہارے لیے شاید اتنا مشکل نہ رہے۔"

"میں اماں اور نانی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔"

"ارے بیٹا! اول اپنا بچہ ہے۔ سارا کا شوہر ہے اس پر تو اعتماد کیا جا سکتا ہے' کتنی اچھی طبیعت والی ہے سارا۔"

"لگتا ہے نانی! سارا آپی نے فون پر ہی آپ کو اپنا مکمل گرویدہ بنا لیا ہے۔" وہ ہنسی۔

"تو مریم بھی آ گئی' اس سے بات کرو۔" نانی نے چائے کا مگ مریم کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اگر ماروی کام کرنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس نے ماں اور نانی کو تشکر سے دیکھا' جن کا اعتماد اپنی ذات پر دیکھ کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا تھا اور اس کے سامنے چائے کے ہلکے سپ لیتا ہوا سرمد جس نے اس کی ذات کو اعتماد بخشا تھا' جس کی محبت نے اس کے اندر کام کرنے کی لگن کو قائم رکھا تھا۔

"تمہارے لیے ایک اور خوش خبری بھی ہے۔" سرمد نے چائے کا کپ ٹرالی میں رکھ کر دروازہ کھولا تھا۔ سامنے گلی میں آلٹو کھڑی تھی۔

"میں نے سوچا' میں تمہیں کہاں موٹر سائیکل پر اڑاتا پھروں گا۔ شادی سے پہلے گاڑی ضروری ہے۔"

ماروی اس کے ماں اور نانی کے سامنے یوں کہنے پر جزبز ہوئی۔ وہ دونوں خوشی سے اسے مبارک باد دینے لگی تھیں۔

"اور ہاں' میں نے گل کی شرط مان کر اس کو دبئی سے بلوا لیا ہے۔ مجھے امید ہے میرا مان ضرور رکھو گی۔" وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر اس کو تکنے لگا۔

"کون سی شرط؟"

"صلح کی شرط۔"

"مگر میرا اور اس کا تو کوئی جھگڑا' کوئی دشمنی' کوئی ناراضی نہیں۔" وہ حیرت سے بولی۔

"تمہاری نہیں مگر انکل اور آنٹی کی ناراضی ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟ سرمد! پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو' صاف بات کرو۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"تم نے مجھ سے کہا تھا نا ماروی کہ دنیا میں تمہاری ایک ہی دوست ایک ہی بہن ہے گل اور اسے تمہاری شادی میں ضرور ہونا چاہیے۔ گل تمہاری بہن بن کر تمہاری شادی میں حصہ لینا چاہ رہی ہے۔ بشرطیکہ تم لوگ انکل مرتضیٰ کو معاف کر دو۔ انکل مرتضیٰ بہت تنہا ہیں' انہیں زندگی میں کبھی محبت نہیں ملی۔ شاید آنٹی کی بددعا ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہی۔ اسی لیے گل کی ماں بھی انہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

وہ اب ایک دم سکتے میں آ گئیں۔

"کیا... گل...؟" ماروی ایک لفظ بھی آگے نہ بول سکی۔

"ہاں گل! تمہاری بہن ہے۔ جب سے اسے پتا چلا وہ دبئی اپنی ماں کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کی واپسی کی صرف ایک شرط تھی' انکل کی معافی۔ انکل مرتضیٰ تمہاری شدید نفرت کی وجہ سے معافی مانگنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اگر تمہارا دل اپنے باپ کو معاف کرنے پر راضی ہو جائے تو مجھے ضرور بتانا۔" اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

"رکو بیٹا! کیا معافی کیا تلافی جو میرے نصیب میں لکھا تھا وہ ہوا۔ ماروی اور تمہاری شادی میں مرتضیٰ اور گل ضرور شریک ہوں گے۔" خاموش بیٹھی مریم نے اٹھ کر اسے روکتے ہوئے کہا تو ماروی نے حیرت سے ماں کو دیکھا' جس کے مضبوط لہجے نے اسے کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ساری زندگی دکھوں اور مصائب میں گزارنے والی عورت کتنی بہادر' کتنی فراخ دل اور درگزر کرنے والی تھی۔

"میں پھر بھی تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔" اس نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تمہارا فیصلہ میرے لیے مقدم ہے۔" وہ لب بھینچ کر پلٹا تھا۔

ماروی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ گل کیسی عزیز دوست تھی اس کی جو اب بہن بھی بن گئی تھی۔ کتنا انمول رشتہ مل رہا تھا اسے۔

"بیٹا! معاف کرنے میں سکھ ہیں۔"

مریم نے اس کا شانہ تھپکا۔

اس نے اپنا سر ماں کے کاندھے پر رکھ دیا۔ گرم سیال گالوں پر بہنے لگا۔

نانی کی تسبیح کے دانے خاموشی سے گرتے رہے۔

"گل! میری دوست' میری بہن...!" اس سوچ کے ساتھ اسے ایک بار پھر شدت سے رونا آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دلدار سے اس کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی' اسے اچھی طرح یاد تھا وہ سردیوں کی شام تھی' جب پانچ بجے اس نے چائے کا پانی چڑھایا تھا۔ اختیار غصے سے گھر میں داخل ہوا۔

"سارا دن گزر گیا' دلدار کو کسی نے کھانا نہیں بھیجا۔ کہاں مری ہوئی تھیں تم؟" اسے سامنے دیکھ کر وہ اس پر برسا۔

"خدا! گھر میں کوئی تھا نہیں جو اوطاق میں کھانا لے کر جاتا۔ میں کس کو کہتی بھلا۔ وہ دیکھیں' کھانا دوپہر سے بندھا رکھا ہے۔"

اس نے تپائی پر رکھے رومال میں بندھی روٹی کی طرف اشارہ کیا۔

"بچے کہاں چلے گئے تھے؟"

"آپ کا بیٹا بخار میں پھنک رہا ہے' آنکھ نہیں کھل رہی اس کی اور ادا! فدا حسین صبح آپ کے ساتھ نکل گیا تھا۔ اس کے بیوی بچے ننھیال گئے ہوئے ہیں پھر

میں کس کو دیتی۔"

"کسی پڑوس کے بچے کو نہیں بلا سکتی تھیں۔ صرف بہانے کرنے آتے ہیں تمہیں۔ دلدار... او دلدار... اندر آجا۔" وہ دروازے پر کھڑے دلدار کو آوازیں دینے لگا۔

مہو کو سخت ہتک محسوس ہوئی۔ گو کہ دروازہ باورچی خانے کے بنے ہوئے چھپر سے دور تھا مگر اختیار کی آواز غصے میں اتنی بلند تھی کہ دلدار تک بخوبی سنی جاسکتی تھی۔

"آج سے دلدار گھر میں کھانا کھائے گا۔ میرا یار ہے یہ۔ میں اسے غیر نہیں سمجھتا۔"

اختیار نے دلدار کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھایا۔

"یہ میری بہن ہے مہو! جلدی کر کھانا لے کر آ۔" اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

دلدار نے ایک نظر اس کے تپتے چہرے پر ڈال کر نظر جھکالی۔

مہو نے ان کے آگے دسترخوان بچھا کر رومال میں بندھا ہوا کھانا اس پر رکھا۔ جگ میں لسی ڈال کر پانی کا جگ اور گلاس بھی آگے رکھے۔

وہ دونوں پاؤں چارپائی پر رکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ رومال سے بندھا ہوا کھانا نکالا۔

لمبائی کی طرز پر چھپر (باورچی خانہ) بنا ہوا تھا جس کو وہ لانڈھی کہتے تھے۔ باورچی خانے کے اسی کونے میں مٹی کے بنے ہوئے چولہے تھے۔ دوسری طرف لکڑی کا بڑا سا تخت تھا جس پر برتن رکھے ہوئے تھے اور روٹی رکھنے کے لیے لکڑی کا نعمت خانہ جس کے چاروں طرف جالی لگی ہوئی تھی' نیچے تین موڑھے اور دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ بیٹھا جائزہ لے رہا تھا۔

سامنے پانچ پکے کمرے جن کے آگے برآمدہ جس میں ٹائل لگے ہوئے تھے جبکہ سامنے کا چبوترے کا فرش سیمنٹ سے بنا ہوا تھا۔

اس چبوترے کے ساتھ دوسرا چبوترا بھی تھا جس کے سامنے بھی تین کمرے اور آگے برآمدہ تھا۔ اس میں بھی ماربل اور ٹائل کا کام تھا۔

یہ ٹائل سندھی قدیمی نقش و نگاری کا بہترین نمونہ تھے۔ ڈیزائن گو کہ قدیمی تھا' عموماً سندھ کی بڑی بڑی حویلیوں' درگاہوں اور مسجدوں میں اپنے اپنے حساب سے استعمال ہوتا آرہا ہے۔ برآمدے کے ہلوز پر شیشے اور چینی کا کام تھا۔ مختلف رنگوں کا امتزاج برآمدے کے باہر کو بڑا دلکش بنا رہا تھا۔ برآمدے میں رکھی پرانی طرز کی بنی ہوئی ہالا کی کرسیاں اور سائیڈ میں جھولا تھا۔ ہلوز کے ساتھ رکھے مرتبانوں میں پھول سجائے گئے تھے۔ کہنے کو تو یہ گھر جدید طرز پر بنا ہوا تھا' جس میں ہر طرح کی سہولت بھی تھی مگر اس کے پرانے طرز کے ٹائلز اور شیشے کے کام کی وجہ سے یہ کسی پرانی شاندار قسم کی حویلی کا تاثر دیتا تھا جو گھر والوں کے مزاج اور روایات کی عکاسی کرتا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے ہر ایک چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"دو کمرے میرے اور دو فدا حسین کے ہیں۔ ایک مہو کا ہے اور یہ سامنے والا گھر اس انقلابی سرد کا ہے۔"

اختیار نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے اسے بتایا۔

سرد کے نام پر وہ دونوں طنزیہ ہنسے تھے۔ چائے ابل کر چولہے میں گری تھی۔ لکڑیاں دھواں دینے لگی تھیں۔

"بند کر لکڑیاں جلانا۔" اختیار کھانستے ہوئے چیخا۔

اس نے فوراً چائے اتار کر لکڑیوں پر پانی ڈال کر بجھایا۔ چائے کپوں میں ڈال کر ٹرے ان دونوں کے بیچ میں رکھ دی۔

اس دن کے بعد دلدار ایک آواز دے کر اندر آجاتا تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا وہیں کھانے لگا تھا۔ وہ اکثر روٹیاں پکا رہی ہوتی۔ فدا حسین کی بیوی سالن نکال کر روٹی اٹھا کر اس کو دے دیتی۔ وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ کر روٹی کھانے لگتا۔ ایک نظر اس پر ڈال لیتا جس کا رنگ آگ کی تپش سے دہک رہا ہوتا۔

آہستہ آہستہ وہ گھر کے فرد کی سی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھی مگر اب اس کی بدلتی نظروں سے گھبرانے لگی۔ بنیادی طور پر عورت بڑی حساس واقع ہوئی ہے۔ مرد کی اٹھتی نظر کا ہر پیغام پڑھنے سمجھنے کا شعور رکھتی ہے۔ دلدار کی نظر کے پیغام سے وہ ڈر گئی۔ وہ اس وقت آتا جب وہ باورچی خانے میں روٹی پکا رہی ہوتی۔ اس کی بدلتی نظر سے گھبرا کر اس نے روٹی جلدی ڈالنا شروع کر دی' تاکہ اس کے آنے سے پہلے باورچی خانے سے نکل جائے۔ دو تین دن اس کا اس سے سامنا نہیں ہوا۔ اس نے شکر کا سانس لیا مگر چوتھے دن وہ جلد ہی روٹی کھانے آگیا۔ وہ اس کا گریز بھانپ گیا تھا۔

"دلدار! آج تو جلدی آگیا۔ ابھی سالن میں تھوڑی دیر ہے۔" دوسرے چولہے پر بیٹھی فدا حسین کی بیوی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بھاجائی! میں لسی سے کھالوں گا۔ آج زمین پر بہت کام کرنا پڑا' اس لیے جلد بھوک لگ گئی۔" اس نے خوامخواہ وضاحت دی۔

"ارے تمہارا اپنا گھر ہے' جب جس وقت جی چاہے' آجایا کرو۔" پیچھے سے آنے والے اختیار نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"ہاں یار! اپنا گھر سمجھ کر ہی تو آتا ہوں۔" اس نے اپنے شانے پر رکھے اختیار کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"اس بار تم نے زمین پر بڑی دل لگا کر محنت کی ہے۔ کماد کی فصل بڑی بھلی (اچھی) ہوئی ہے۔ ہر دیکھنے والا تعریف کرتا ہے۔" اس نے استری لگے کپڑوں کو جھاڑ کر نامعلوم شکنیں دور کیں۔

"ہاں' اللہ بری نظر سے بچائے۔ کہاں جارہے ہو؟"

"جرگہ ہے سردار کے بنگلے پر۔ اس کے انتظامات دیکھنے ہیں۔"

"کتنا خون بہا دیا جائے گا؟"

"تین لاکھ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اگر سنگ چٹی (خون کے بدلے رشتہ) میں دیا گیا تو ورنہ یہ جرمانہ دو تین گنا بڑھ بھی سکتا ہے۔"

"مگر ان کے پاس تو مقتول کے باپ کے علاوہ کوئی مرد نہیں جس کو خون کے بدلے رشتہ دیا جائے۔" دلدار نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہ فیصلہ سردار کرے گا کہ مقتول کی برادری میں سے قاتل کی بہن کا رشتہ کس کو دیا جائے۔"

اختیار نے مونچھوں کو مروڑتے ہوئے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"تمہیں نہیں پتا کیا کہ رشتہ دینے کا فیصلہ سردار کرتا ہے۔ سردار سائیں کی مرضی وہ لڑکی فائنہ کسی شینیہ (شیر) کے کاندھے پر چڑھائے۔"

اس نے ہاتھ مسلتے' زمین پر ایک پاؤں ہلکے سے مارا اور ہاتھ جھاڑتا سینہ تان کر کروفر سے باہر نکل گیا۔

اور پتہ نہیں کیوں اس دن دلدار کی نظر اس کے چہرے پر ٹھہر گئی۔

کسی خوف یا جھجک کے بغیر' وہ بھاجائی کا بھی خیال نہیں کر رہا تھا' وہ اسے دیکھے بغیر تیزی سے روٹیاں بیلنے لگی۔

بھاجائی نے ایک نظر یک ٹک اسے دیکھتے دلدار کو دیکھا پھر بے پروائی سے روٹی پکاتی مہو کو' جس کی سفید رنگت آگ کی تپش سے سرخی مائل ہو رہی تھی یا غصے سے' وہ اندازہ نہیں لگا سکی۔

☼ ☼ ☼

جام شورو گارڈن بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ بہترین لائٹنگ نے آسمان کے تاروں کو چھپا دیا تھا۔ ہر آنے والا مہمان کو گیٹ سے داخل ہوتے ہی خوشگوار احساس گھیرے میں لے لیتا۔ سامنے اسٹیج تک راستے پر ریڈ کارپٹ پر چل کر ہر کوئی دولہا دلہن تک پہنچ کر مبارکباد کے پھول نچھاور کر رہا تھا۔ یہ سارا انتظام رئیس غلام مرتضیٰ نے اپنی بیٹی ماروی کی شادی میں کیا تھا۔ وہ شاداں و فرحاں ہر مہمان کو بھلیکار (خوش آمدید) کر رہا تھا۔ ویلکم کرنے والوں میں اس کے ساتھ گل اور زیب النساء ساتھ ساتھ تھیں۔ "آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔" جیسے جملے ان کی سماعتوں کو بھلے لگ رہے تھے۔ وہ مبارک وصول کرتے' خوشی سے' سرشاری سے مسکرا اٹھتے۔

اس شادی میں ہر حلقے' ہر طبقے کے لوگ شریک تھے۔
سرمد اور ماروی کا صحافتی اور این جی اوز کا حلقہ رئیس غلام مرتضیٰ کے دوست احباب سرمد کے گاؤں کے لوگ سوائے اس کے چچازادوں کے خوش تھے۔ ان کی سچائی اور محبت و خدمت تھی جس کا صلہ آج دعاؤں کی صورت مل رہا تھا۔ سفید شلوار قمیص اور بلیک واسکٹ میں ملبوس رئیس مرتضیٰ نے وہیں گیٹ کے قریب پڑی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک نظر اسٹیج پر بیٹھے دولہا دلہن اور ان کے پاس بیٹھی مریم اور نانی کے خوشی سے دمکتے چہروں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔
اسے یہ موقع سرمد کی دانش مندی نے فراہم کیا تھا' جہاں وہ کچھ نہ کچھ ازالہ کرکے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرسکا تھا۔ اسے وہ دن یاد آرہا تھا جب وہ مارے شرمندگی کے مریم کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا پارہا تھا۔
اس چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں جس کے ایک صوفے پر سرمد' نانی اور مریم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو دوسرے پر گل اور ماروی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ان کے سائیڈ والے صوفے پر وہ مجرم بنا بیٹھا الفاظ کو ترتیب دے رہا تھا' جو بار بار بکھرتے جارہے تھے۔ گہری دھند جیسی خاموشی تھی جو ہر نفس پر طاری تھی۔
"انکل! آپ کو کچھ کہنا ہے؟" سکوت کے سمندر میں سرمد نے اپنی آواز کا پتھر پھینکا اور اس کی گویائی جیسے لوٹ آئی ہو۔
"مریم! میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ اپنی محبت کے صدقے مجھے معاف کردو۔" اس نے اپنی ٹوپی اتار کر مریم کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔ بلوچی خون اس کے سفید چہرے پر سمٹ آیا۔
مریم نے تڑپ کر اسے دیکھا اور اس کی ٹوپی اٹھا کر سرمد کی طرف بڑھادی۔ اس کی محبت میں وہ گھر سے نکلی تھی' جس نے بیچ منجدھار میں اسے زمانے کے ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس کی بے وفائی کا زخم تو وہ ساری عمر سہتی رہی تھی۔ لوگوں کی مشکوک نظریں' عورتوں کے طعنے' مفلسی' تنگ دستی' کیا کچھ نہیں سہا تھا۔ اس کی نظر ماروی پر پڑی جو آنسو پینے کی کوشش کررہی تھی۔
"رئیس! مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ یہ سب تقدیر کے لکھے نصیب کے کھیل ہیں جہاں انسان بے بس کھڑا رہ جاتا ہے۔ ہم ایک راستے پر چلنا چاہتے ہیں اور تقدیر ہمیں دوسرے راستے پر لے جاتی ہے۔ میں نے آپ کو بہت پہلے معاف کردیا تھا' جب تقدیر کی حقیقت میری سمجھ میں آگئی۔" سرمد نے اٹھ کر وہ ٹوپی رئیس مرتضیٰ کو پہنادی۔ رئیس نے دونوں بیٹیوں کو بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ وہ اس کے سینے سے لگی کھڑی تھیں۔ وہ دونوں کو گلے سے لگائے ان کا سر چوم رہا تھا۔
ماروی اس کے سینے سے لگ کے رو پڑی تھی' اس سے زیادہ بہتر کون جان سکتا تھا کہ ماں کی گود پناہ گاہ اور باپ کا سینہ سائبان ہوتا ہے۔ وہ اس سائبان کے نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو بھیڑیوں کی زد میں آئی تھی۔
کتنی ہی دیر آنسو بہانے کے بعد اس نے مرتضیٰ کے سینے سے سر اٹھا کر گل کو دیکھا' جو مرتضیٰ کے دوسرے کندھے سے لگی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ ان دونوں کی نظریں ٹکرائی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی لال آنکھوں کو دیکھ کر بے ساختہ روتے روتے ہنس پڑی تھیں۔
اس ملاپ نے جہاں سب کی آنکھیں نم کی تھیں' وہاں لبوں پر مسکراہٹیں بھی بکھیر دی تھیں۔
"میں نے زندگی میں اپنی بیٹی کی کوئی ذمہ داری نہیں نبھائی۔ اب اپنی بیٹی کی شادی کی ذمہ داری میں خود اٹھانا چاہتا ہوں۔" مرتضیٰ نے مریم کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھا۔
"جیسے آپ کی مرضی سائیں! یہ آپ کی بیٹی ہے۔" مریم نے سر جھکا کر کہا تھا۔
گل نے ساری تیاریاں ماروی کے ساتھ مل کر کی تھیں۔ ہر وقت اس کو گھسیٹتے وہ حیدر آباد اور کراچی کے شاپنگ سینٹرز کے چکر لگواتی رہتی۔
"گل! بس کرو اب۔" وہ اکثر جھنجلاتی۔
"تم چپ رہو' دلہن نہیں بولتیں۔"
"ہاں دلہنیں نہیں بولتیں لیکن وہ یوں گھوم گھوم کے شاپنگ بھی نہیں کرتیں۔"
"نہیں بھئی' اب اتنا تو دور بدل بھی گیا ہے۔" گل ہنسی۔
"اپنی بات کے حق میں فوراً" دلیل ڈھونڈ لاتی ہو۔"
یوں شادی کی تیاریوں میں دن پر لگا کر اڑ گئے تھے۔
اور اب جام شورو گارڈن میں رنگ تھے' روشنیاں تھیں۔ ہر فرد مسرت سے ہمکنار تھا۔ ہنسی کے پھول ہر ٹیبل کے گرد بیٹھے لوگوں کے ہونٹوں پر کھل رہے تھے۔
اسٹیج پر بیٹھے سرمد نے ایک بھرپور نظر ماروی پر ڈالی' جو میرون برائیڈل ڈریس میں پاگل کردینے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔
اس کی نظروں کی تپش اور وارفتگی محسوس کرکے ماروی کی نظر بے ساختہ اس کی طرف اٹھ گئی تھی۔ نظروں کے اس ملاپ نے ان کے ہونٹوں پر تبسم روشن کردیا تھا۔
"اگر میری محبت روشنی کی صورت ہوتی تو تم اتنی روشن ہوجاتیں کہ جہاں بھی اندھیرے میں قدم رکھتیں تو اجالا ہوجاتا۔"
اس کی سرگوشی نے اس کی سماعت میں رس گھولا۔ کھانا لگ چکا تھا' لوگ مصروف ہوئے تو اس نے اپنے دل میں پنہاں بے تاب اظہار کو اس کی سماعتوں کی نذر کیا۔
"اگر میری محبت خوشبو کی صورت ہوتی تو تم اتنی معطر ہوجاتیں کہ جہاں بھی جاتیں' ساری فضا معطر ہوجاتی۔"
وہ متبسم ہوئی۔
"اگر میری محبت خوشی کی صورت ہوتی تو دنیا تمہیں دیکھتے ہی مسکرانے لگتی۔"
محبت کے اس اظہار پر ماروی کی آنکھوں میں خوشی سے نمی تیرنے لگی تھی۔
"میں اپنا دل دیکھتا ہوں تو وہ محبت کے لیے تنگ پڑنے لگتا ہے۔ مجھے دنیا میں' کائنات میں کوئی پیمانہ ایسا نظر نہیں آتا جو میری محبت کو ناپ تول سکے۔"
اس کا ہاتھ اس کے مہندی رچے ہاتھوں پر آٹھہرا۔ اس سہانے سمے کی شاخ پر محبت کی شبنم گررہی تھی۔
اور وہ اس نمی پور پور بھیگ رہی تھی۔
ایک دعا جو ہر لب پر مچل رہی تھی۔
"خدا کرے کشمیر سے لے کر کراچی تک سندھو کنارے یونہی آباد رہیں' شاد رہیں۔
کراچی سے کارونجھر تک' کارونجھر سے کشمور تک' کشمور سے کوئٹہ تک' کوئٹہ سے کھوکھر تک' کھوکھر سے کوہاٹ تک۔
خدا کرے یہ سبھیں ہمیشہ سجی رہیں۔
کبھی ماؤں کی گودیں خالی نہ ہوں' کبھی خوشیوں کے پھول نہ مرجھائیں۔ امن' خوشحالی اور سکون اس قوم کا نصیب ہو۔ (آمین)"
ان کے دلوں سے بے ساختہ دعا نکلی تھی۔ *

دل دا دیس
ثمرہ بخاری